

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222697

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—831—5-8-74—15,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹/۵۷۳۱۷ Accession No. ۲۷۱۹۴۴

Author خ / ۱۹۷۷

Title رفیق خاور

خاتمانی نند (ایک مطالعہ)

This book should be returned on or before the date last marked below.

خاتمانی ہند

(ایک مطالعہ)

از
میاں محمد رفیق طاہر

۱۹۴۴

جملہ حقوق محفوظ

صورت نہ پرستم من بتجائہ شکست من
گفتند جان ما آریا به تو می سازد
آں سہل سبکسریم بہر بند شکست من
گفتم کہ نے سازد گفتند کہ برہمن
آقبال

سلسلہ شعرائے اردو

خاقانی ہند

یعنی

حب بدایین تنقید کی روشنی میں شیخ محمد ابراہیم ذوق مرحوم

آرٹ اور شخصیت کا ایک عمیق مطالعہ

1944

از

میاں محمد رفیق خاور ایم۔ اے

قیمت ایک روپیہ

۳۳ ۹

جلد اول پانچواں

عالمگیر لکچر ہاؤس، لاہور، پاکستان
حفاظت محکمہ عالم پرنٹرز کے چھپا۔

A 914 1414

خ

انتقاد

HYDERABAD-7

CHECKED 1963

2914314

R kh

میاں محمد رفیق ایم اے کی کتاب 'خاقانی ہند' بعض ادبی حلقوں میں نہایت سستی خیز ثابت ہوئی۔ اس میں ان جدید ادبی اصولوں پر بحث اور ان کی نشر و اشاعت کی کوشش کی گئی ہے۔ جو جدید ماحول اور اثرات کا لازمی نتیجہ ہیں اور ساتھ ہی ان قدیم ادبی اساسیات کی تردید کی گئی ہے جنکی وجہ سے ہمارے ادبیات اور صحیح ادبی حسیات پر قصبہ جو طاری تھا۔ فادر صاحب نے ہماری ادبی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ جو یقیناً صدائے بھارت نہیں ہوگی کیونکہ ان کے سچائی اور ہمنوا کئی ایک جوانان پر جو غور اور بھی میں۔

پروفیسر فیاض محمود ایم۔ اے ایک بائیس سالہ نوجوان کا شاعری اور تنقید میں لامتناہی کتابیں تصنیف کرنا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ خباب فادر شاعری میں ایک نئے طرز اور ادب میں ایک نئے درجے کے بانی ہیں۔ فادر کی تنقید انکی شاعری کی مانند لاجواب ہے۔ خاقانی ہند اردو میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے۔ فادر نے قدامت پرستی کے خلاف نہایت بے باکی سے اعلان جنگ کیا ہے۔ وہ جدید خیال طبقہ کے بہترین نمائندہ ہیں۔ میاں کفایت علی بی۔ اے۔

برادر عزیز! تم نے اردو کے رائج الوقت ادبی توہمات کی خوب تردید کی ہے اور تمہاری اکثر رائیں اور فیصے درست ہیں۔ میں تمہارے بے شکلف و غرض خیز تنقید پر ترکیب اور جذبہ طعن کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارے ذہن کی صفائی و تہیز محض ہے۔ آقباس از مکتوب میاں لہدق حسین خالد ایم اے ڈپٹی پرنسپل سکول آف آرٹس سنڈرز لندن

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر
۱	اعتقاد	۱
۱	دیباچہ	۲
۵	پہلا باب - اصول تنقید	۳
۵۱	دوسرا باب - سوانح حیات	۴
۶۰	تیسرا باب - ماحول اور اُس کے اثرات	۵
۱۰۳	چوتھا باب - ملکات و جہان اور شخصیت	۶
۱۴۷	پانچواں باب - آرٹ	۷
۱۹۸	چھٹا باب - موازنہ ذوق و غالب	۸

دیباچہ

اردو ادب ایک مدت سے مغربی ادبیات کے زیر اثر ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جدید ادبی تحریک جس کو عام طور پر علیگڑھ کی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنے ظہور کیلئے تاثر مغربی اثرات کی نمون احسان ہے۔ سرسید اور حالی کے زمانہ سے لیکر اب تک جتنے بلند پایہ شاعر اور ادیب گزرے ہیں۔ انکی تحریات میں انگریزی ادب کے اثرات کی جھلک کسی نہ کسی صورت میں ضرور دکھائی دیتی ہے شاعری اور تنقید تو خاص طور پر ان اثرات کی آئینہ دار ہیں۔ ہمارے بہت سے ممتاز ادیبوں نے مغرب کے تنقیدی اٹھو لوں کو اسٹوڈنٹس رولج فیض کی کوشش فرمائی ہے۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری شبلی کی تنقیدی قضائیت اور آزاد کی بعض تحریروں۔ آفتاب مغرب کی پہلی روشن کرنیں ہیں۔ جنہوں نے اردو تنقید کی تاریخ دُنیا کو طلوعِ سحر کا پیغام دیا۔ لیکن افسوس وارباب ادب نے ان جدید اٹھو لوں کو صحیح طور پر نہ سمجھا۔ اور ہماری ادبی دُنیا میں بہت سی بد عنوانیاں سرایت کر گئیں۔ اس وقت اردو شاعری اور تنقید کی لیا لہ ناواقف ادیبوں کے ہاتھوں اس قدر درہم برہم ہو چکی ہے کہ نظماں ہر اصلاحِ مفاہیم کی کوئی صورت نظر نہیں آتی مصلحین فن کو ہر طرف دشواریاں نظر آتی ہیں۔ کوئی شعبہ ادب نہیں۔ جس میں اصلاح کی ضرورت نہ ہو۔ کوئی صنعت بیاں نہیں جس کے لب پر اپنے والے سنگارِ دامن کی ستم کوشیوں

کی فریاد نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر نقادوں کی بے آئینی اور شعرا کی بے راہ روی کسی طرح سلامت روی میں تبدیل ہو سکتی ہے تو وہ تنقید کے جدید اصولوں کی تبلیغ و اشاعت سے ہے۔ نیکی اور عاقلیٰ نے اپنے معلومات کے مطابق جو اصول مرتب کئے ہیں حد تک درست تھے۔ مگر اب ہمارے مثنویات اور ذہنیات میں اس قدر تبدیلی پیدا ہو چکی ہے اور ہمارا مذاق اسلاف سے اس قدر مختلف ہو چکا ہے کہ حالات زمانہ کے مطابق نئے اصول وضع کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ تصنیف ہذا میں ہم نے یہی جدید اصول مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ساتھ ہی ان کو عملی طور پر استعمال کر کے ظاہر کیا ہے کہ ہم ان سے کس قدر صحیح اور قطعی نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری تنقید ذوق کے مرتبہ واقعی پر آخری لفظ ہوگی۔ کم از کم جدید تعلیم یافتہ حضرات ہمارے تمام فیصلوں سے اتفاق کریں گے۔

یہ اور اس سلسلہ کی دیگر تصنیفات اردو کے تمام گزشتہ و موجودہ قابل ذکر شعرا کی طبیعت اور آرٹ کے عمیق مطالعہ پر مشتمل ہوں گی۔ اس کام سے فراغت پانے کے بعد ہم مصنفین اردو کو اپنی تنقید کا موضوع بنائیں گے۔ تاکہ جہاں تک نقد و نظر کا تعلق ہے۔ اردو زبان میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔ ہمارے خیال میں جدید آئین تنقید اور عقاید و خیالات کی ترویج و اشاعت کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ کہ ان کو عملی طور پر استعمال کر کے درست ثابت کیا جائے۔ اگر ہم اپنے مقاصد میں کامیاب رہے اور اباب ادب نے ہمارے نظریوں کو درست تسلیم کر لیا۔ تو وہ عام بد مذہبی اور پریشان کن افراتفری خود بخود دُور ہو جائے گی جس کی جدید تعلیم یافتہ حضرات کو اس قدر شکایت ہے اور جو فی الواقع اُردو ادب کی ترقی میں ایک سنگِ گراں ہنجر حائل ہے۔ بہر حال ہم امید کرتے ہیں کہ اباب نظر اس کتاب

میں پیش کئے ہوئے نظریوں پر پوری پوری توجہ دیں گے۔ اور مستحق کو اپنے قیمتی مشورہ و عمل سے مستفید فرمائیں گے۔

اس کتاب کے مباحث اور محاکمات کو دیکھ کر لہجہ صحابہ کو ضرورت ہے۔ گزشتہ گام کے ہم نے انتہا پرست مغرب زدہ نقادوں کی مانند ناقابل تسلیم نظریے اور آئیں پیش کر کے اُن باتوں کی تردید کی ہے۔ جو ادبی حلقوں میں سکوت کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ ہم اس کے جواب میں صرف یہی کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک غلط مسلمات نامی تردید شد ضروری ہے۔ اور ہم نے اس کتاب میں صرف اپنی ادبی فیصلوں سے تعرض کیا ہے جن کو ہم درست نہیں خیال کرتے۔ جو باتیں ہمارے خیال میں درست ہیں۔ اُن پر ہم نے کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ چل رہے ہیں۔ کہ قدیم مرثیہ اور مذاق کے لوگ اُس عظیم ذہنی انقلاب سے بالکل بخیر ہیں۔ جو گزشتہ چار پانچ سالوں سے پنجاب کے نوجوان ادیبوں۔ شاعروں اور نقادوں کی طبیعت میں پیدا ہوا ہے یہ انقلاب زیادہ تر مذاق۔ خیالات اور آراء کے اختلاف پر مبنی ہے۔ پنجاب کا نوجوان طبقہ جس کی موجودگی کا اہل زبان اور اُنکے قدامت پرست ہم مشربوں کو قطعاً علم نہیں۔ چند سال میں اردو ادیب اور صحافت پر چھا جائیگا۔ جبکہ ایک حد تک اس پر متعرف ہو چکا ہے۔ رقم الحروف نے اب تک نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس طبقہ کے ایک نمائندہ۔ ایک طائرِ پیش رس کی حیثیت سے لکھا ہے۔ اس لئے اگر قدیم نواسیجان گلشن ہماری نو آئین نو آئیوں پر برہم ہو یا ہم کو انتہا پرست قرار دیں تو ہمیں اُن کی مخالفت کی مطلق ضرورت نہیں۔ ہم اپنی جگہ پر اُن محکم زبانوں کی طرح مطمئن ہیں جن کو سمندر کی تیز دھند موجیں اُن کے مرکز ثقل سے ہلانا چاہتی ہیں۔ مگر وہ ان کو بے اثر محسوس کرتے ہوئے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ہمارے کفن پرانے رنگ کے بے ذوق قارئین کی طرف

ہیں۔ بلکہ نثر اور لفظ کی طرف ہے۔ جو ہمارے خیالات کو سمجھ سکتا ہے اور ہماری باتوں کو سننے کے لئے تیار رہے۔

اس کتاب کا نام 'فا قانی ہند' شاعر مروجہ کے مشہور خطاب کی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ شیخ کو ہندوستان کا 'فا قانی' قرار دینے سے اُنکی بلند پایگی کا اعتراف لازم نہیں آتا۔ ایرانی شاعر کے کلام میں پھر بھی ایسی کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ ایک برگزیدہ شاعر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ذوق کی شاعری کیفیت شعریّت سے بالکل موافق ہے۔ اس لئے ہم اُن کی عظمت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔

ہم چاہتے تھے کہ کتاب کے ساتھ ذوق کا دیوان بھی شائع کریں جس میں قارئین کی سہولت کے لئے مشکل اشعار کے مطالبے معانی درج ہوں مگر موجودہ اقتصاد سی اضمحلال کے زمانے میں ان تخیلات کو عملی جامہ پہنانا نہایت دشوار ہے۔ پھر بھی ہم کوشش کریں گے کہ دیوان ذوق کا ایک مفیدہ ادبیت شاعر ہو۔ جس میں اردو خواں پبلک کی تربیت ذوق کے لئے مفید ہدایات کے ساتھ مشکل شعروں کے معنی قلم بند کئے گئے ہوں۔

ان ضروری اشارات کے بعد ہمیں اُن اصحاب کے شکریہ کا خوشگوار فرض ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے اس کتاب کے غیر مطبوعہ اجزائے پریشان کا مطالعہ فرما کر ہمیں ادبی دنیا میں ایک نقاد فن کی حیثیت سے وارد ہونے کی جرأت دلائی۔

ہم اپنے محترم استاد خان صاحب قاضی فضل حق - ایم۔ اے اور اردو کے مشہور نقاد پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم اے کے بہت شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف لکھی گئی ہے کہ ہمیں اپنے مفید مشوروں سے مستفیض فرمایا۔ مراد حضرت عاتق بابر چپ و راست کہ مجھ کو یہ تکمیل و نہ غم ماہ خطاست

ابن دو خضران راہ کے علاوہ ہمارے ابن علم میں کفایت علی صاحب
بی نے بھی ہمارے بہترین شریہ کے منتقد ہیں کیونکہ آپ نے اس کتاب کی تیاری
میں ہماری ہر ممکن مدد فرمائی ہے۔ انتقاد کے زیر عنوان آپ نے
ہماری شاعری اور تنقید کے متعلق جن دلخوش کن خیالات کا اظہار فرمایا
ہے۔ ایک فوجی ادیب کے تو سن بہت کسے لئے ہمیز کا حکم رکھتے ہیں! امید
ہے کہ آپ آئندہ بھی ہماری ادبی سرگرمیوں میں حصہ لے کر ہمیں شکر دیا
کا موقع دیں گے۔

انتقاد کے زیر عنوان صرف اپنی احمک لائیں درج کی گئی ہیں مگر ہمارے نزدیک ہر
واقعہ ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ اور کتابت کے متعلق ہم خاموشی ہی مناسب خیال کرتے ہیں۔
اردو میں کتابت کے متعلق ہی کہہ دینا کافی ہے کہ دشواری رہ دو تم ہر ٹاں نہ پوچھ

رفیق منزل باغبان پورہ
۲۵۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء

خاور



جو مجلسِ تاریم صدر مدہ خاک افکندہ غوغا
کہ نو پرواز م و شاخِ بلند آشیں دارم
(نظیری)

پہلا باب اصول تنقید

موجودہ اردو ادب کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسا معیارِ تنقید ہے جس کو تمام ادبی حلقوں میں درست تسلیم کیا جائے اور جس سے تمام اصنافِ ادب کا امتحان کیا جاسکے۔ اس وقت ہماری دنیائے ادب میں جو خیالات، آراء اور مذاق کا تون نظر آتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسا معقول آئین اور اصول نہیں جن کو اس بابِ ادب متفقہ طور پر درست تسلیم کریں۔ اہل زبان اور اُنکے جدید تعلیم یافتہ ہم خیال اب تک قدیم اصولوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور ایک خاص مذاق رکھتے ہیں جس کو جدید اربابِ ذوق پسند اور فرسودہ قرار دیتے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات ایک مدت سے مغربی آئینِ تنقید کو اردو میں رائج کرنے پر متصر ہیں لیکن مخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ مشرق کی ادبی روایات کو مغرب کی ادبی روایات سے کوئی مناسبت نہیں۔ مشرقی شاعری اور ادب کو مغربی آئینِ تنقید کی روشنی میں پرکھنا ناممکن ہے۔ غرض فریقین میں ایک طویل مدت سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہے۔ اور کوئی نتیجہ خیز فیصلہ صادر نہیں ہوا۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ اس پرانی بحث کا فیصلہ کیا جائے کیونکہ اردو ادب کی ترقی تمام تر اسی بات پر منحصر ہے۔ بدیہیہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر تمام قدیم و جدید اربابِ ادب کی توجہ و محنت کا دارومدار ہے۔ اس لئے

ہم سطور ذیل میں اس پر جامعیت کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔

شاعری مغربی یا مشرقی نہیں۔ بلکہ ایک عالمگیر چیز ہے۔ اس لئے اس کو پرکھنے کے اصول بھی ہر دیار اور ہر بلد میں ایک ہی ہیں۔ اگر شرعی مابہت پر غور کیا جائے۔ تو مغربی اور مشرقی شاعری کی تفریق بے معنی معلوم ہوگی۔ اہل مغرب کے نزدیک شاعری الفاظ کے ذریعہ سے دلنات قلبی کی نمودن اور متخیلاتہ ترجمانی ہے۔ اگر زیادہ موٹھکتی سے کام نہ لیا جائے۔ تو شعر کی یہ تعریف تمام ارباب فہم کے نزدیک قابل تسلیم ہے۔ مشرقی نقاد بھی اس تعریف کو درست تسلیم کرتے ہیں ظاہر ہے کہ جب مشرق اور مغرب کے عقاید شعری میں کوئی اصولی فرق نہیں۔ تو ان کی ظاہری صورتوں میں بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

شعر کی حقیقت اور بنیادی اصول کی نسبت اتفاق رائے کے باوجود شاعری کے متعلق اختلاف بنیادیت عجیب انگیز ہے۔ لیکن اگر جدید ادبی تحریک کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس اختلاف کے ذمہ دار ایک حد تک جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی ہیں۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قدیم اردو شاعری بہت سے معائب کی حامل ہے۔ ان معائب کی وجہ سے اس کا غالب اثر ہمیشہ ناگوار رہتا ہے۔ لہذا قارئین کے تنفر کا اظہار بھی نرم الفاظ میں نہیں ہوتا۔ وہ قدیم شاعری کی غرض و آئندہ خصوصیات سے برہم ہو کر اس کو سر اسر ناقص قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا بہت سا حصہ ناقص ہے۔ قدیم شاعری کے سر نہ جانے ان کی طرز فکر سے ایسا محسوس کرتے ہیں کہ گویا وہ مشرقی شاعری کو بالکل غیر فطری اور برقعہ قرار دیتے ہیں۔ اس لئے جدید تعلیم یافتہ حضرات کو 'مخلوق' اور 'یورپ زدہ' قرار دیکر مشرقی شاعری کی مدافعت کرتے ہیں۔ اس مدافعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مغربی

شاعری کو مشرقی شاعری سے بالکل مختلف قرار دیا جائے۔ چنانچہ وہ یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مشرقی شاعری کی روایات اور میں۔ اصول اور ہیں۔ نھما اور ہے۔ یہ مغربی آئین تنقید پر پوری نہیں اُتر سکتی۔ بہتر یہ ہے کہ مشرقی شاعری کا اس کے اپنے اصولوں سے جائزہ لینا جائے۔ بالآخر مزاج بقطعی اور دیگر خصوصیات ایشیائی شاعری کا متاع خاص میں ناقہ اور فن کو تنقید کرتے وقت یہی اصول پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ مغربی اور مشرقی آئین تنقید کی نامواثقت کا نظریہ ایک شدید غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ وہ حقیقت مشرق و مغرب میں نفس شعر اور حقیقی شاعری کی خصوصیات کی نسبت کوئی اختلاف نہیں۔ چونکہ قدیم اور قدیم شاعری میں صورت کو معنی پر تقدم تھا اس لئے اس کا بہت سا حصہ لازمی طور پر ناقص ہے۔ جدید آئین تنقید کی زد اسی حصہ پر پڑتی ہے۔ اس کا زندہ جاوید حصہ بدستور محفوظ ہے۔ اگر قدیم شعر کے پرستار یہ گوارا نہیں کرتے کہ اس آئندہ کی شاعری کے نقائص کی توفیق کی جائے تو وہ ایک غیر ناقہ رائے روش اختیار کرنے کے مجرم ٹھہرتے ہیں۔ تنقید کے لئے ماضی اور حال۔ غائب اور حاضر برابر ہیں۔ وہ کسی کا لحاظ اور احترام نہیں کرتی۔ اگر درست ائمہ لوں کی رو سے قدیم یا جدید شاعری کا کچھ حصہ ناقص ٹھہرتا ہے۔ تو ہمیں اس کو ناقص تسلیم کرنا پڑے گا۔ ناقہ اور

۱۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے؟ مغرب و مغرب ہے۔ اور مشرق مشرق کا معقولہ غلط ہر روایات مختلف ہوں تو ہوں لغت شعری کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمارے نقاد اپنے تعصبات کو ترک کر کے حقیقت کی تلاش کریں تو انکو ایشیائی شاعری کی مہافت کی ضرورت نہیں پیش آ سکتی۔

کی صاف گوئی پر اس لئے برہم ہونا کہ وہ راست گفتاری سے کام لیتے ہیں۔ صریح تعصب ہے۔ ہیں ادبی معاملات پر جذبات سے الگ ہو کر نظر ڈالنی چاہئے۔ اگر اس آزادانہ انداز میں شعری ماہیت پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ شاعری عام اس سے کہ وہ مغربی ہو۔ یا مشرقی ایک ہی قسم کے اصولوں کے ماتحت ہے۔ یہ اصول وہ عالمگیر اصول ہیں۔ جن کی درستی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔

آرٹ میچ معنوں میں شخصیت کا اظہار ہے۔ شخصیت سے ہماری مراد وہ جذبات۔ خیالات۔ حسیات۔ عادات و خصایل۔ رجحانات اور دل و دماغ کی قوتیں ہیں۔ جنہ ایک مکمل سیرت تیار ہوتی ہے یوں تو ہر انسان ایک مکمل سیرت کا مالک ہے۔ مگر ہر انسان اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ شرف صرف اہل فن کو حاصل ہے۔ کہ وہ اپنی سیرت کا عکس پیش کریں۔ اور ساتھ ہی دوسروں کی سیرت کا نقشہ بھی کھینچ کر دکھائیں۔ اگر وہ صرف اپنی شخصیت کی تصویر کھینچ جاتے ہیں۔ تو اس کے لئے کسی قدر تخیل۔ حساس طبیعت اور قوت بیان کی ضرورت ہے بعض مصورانِ فطرت۔ رقتِ تخیل کے بغیر بھی کام چلا سکتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں تصویر زنجین نہیں ہوگی۔ اس میں عقل و شعور کا دخل زیادہ ہوگا۔ پھر بھی اگر حقیقی جذبات کا ذخیرہ موجود ہے۔ تو وہ بڑی حد تک عسرتِ تخیل کی تلافی کر سکتا ہے۔

بعض شاعر اپنی شخصیت کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اور دوسروں کی سیرتوں کی تصویر بھی کھینچ سکتے ہیں۔ اس کام کے لئے زیادہ جامع اور وسیع تخیل کی ضرورت ہے۔ تمام دنیا کی ادبی تاریخ میں ایسے تین چار شاعر

ہی نظر آئیں گے۔ جن کا حلقہ تخیل تمام کائنات سے ہم آغوش ہے۔ بہر حال اتنا ظاہر ہے کہ شاعری کیلئے خواہ اس کا دائرہ وسیع ہو خواہ محدود تخیل اور احساس لوازمات میں سے ہیں۔ ایک حقیقی شاعر کیلئے صدق الظہار اور سب باتوں پر مقدم ہے۔ پیشتر اس کے کہ صاحب سخن کے تخیل یا شاعرانہ حیثیت پر بحث کی جائے۔ یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ اس کے جذبات آمدیں یا آورد۔ جب تک کسی شخص کے دل میں محرک یا ارتعاش نہیں ہوتا۔ جب تک اس پر کوئی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ وہ شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس کے اشارہ و مانع کے پردہ سے نکلتے ہیں۔ دل کی تہ سے نہیں نکلتے۔ ان میں عقل کی شبہ کاری ہوتی ہے۔ تخیل کی سحر کاری اور آشفتنگی نہیں ہوتی۔ سچی شاعری میں ہیں جذبات کا احساس پہلے ہوتا ہے۔ ہم اس کو طرہ کربے اختیار جھوم جاتے ہیں اور ایک وجدانگیر کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ اس تشرکاً سبب ظاہر کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ ہر انسان اس کا خود تجربہ کر سکتا ہے۔ کہ اچھا شعر پڑھنے سے اس کے ساز دل کا کون سا تار مرتعش ہوتا ہے۔ جھینپ کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔

رنگ بدلا یا رکادہ پیار کی باتیں گئیں وہ ملاقاتیں گئیں۔ وہ چاندنی راتیں گئیں
بی تو لیتا ہوں مگر پیسنے کی وہ باتیں گئیں، وہ جوانی وہ سیمستی وہ برساتیں گئیں
آئندہ اللہ کر کے لیں اک آہ بھرتازہ گیا وہ نمازیں وہ دعائیں وہ مناجاتیں گئیں
راہ و سیم دوستی قائم تو ہے لیکن جھینپ
ابتداءً شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں

اس میں تسانت ہے۔ درد ہے۔ سوز و گداز ہے۔ اس کو پڑھنے سے طبیعت پر ایک سکون کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یہ خالص جذبات کی غزل ہے انسان اس کو طرہ کراز خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ستودا کا ایک شعر ہے یہ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زبانیں ترپے ہر مرغ قبلہ نما آشیانے میں

بعض نقاد اس کو ایک اچھا شعر کہتے ہیں۔ مگر یہ کن خصوصیات کی وجہ سے
جانب نظر ہے؟ اس میں داغ اور آغ کی مانند شان و شوکت، طراری، چستی
دکھاوے کا جوش اور الفاظ کی بھڑک بھڑک، ہم آہنگی، ہم آہنگی، جھومتے
ہیں۔ انکھیں چمک سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن برق طور کا جوش رہا اثر نہیں تو
عقل بھڑک جاتی ہے مگر دل سرور رہتا ہے۔ اس سے طبیعت پر سکون کی
حالت طراری نہیں ہوتی۔ ذوق کا ایک مشہور شعر ہے۔

اے شمع تری عمر طبعی ہے ایک رات

مہں کر گزار۔ یا اسے رو کر گزار دے

اس شعر کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ اور یہ بڑی حذک اس تعریف کا
مستحق بھی ہے۔ اس کے اثر کا سبب صرف اس کا معنوں اور بندش کی چستی ہی
اسی زمین میں ذوق کے ایک غیر معروف ماحصر کا شعر ہے۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہی کہنے

تھوڑی سی رہ گئی ہے اے بھی گزار دے

اسیں شبہ نہیں کہ عمر طبعی کی شوخ ترکیب نے پہلے شعر کو بہت چست بنا دیا ہے
اور یوں بھی اس کا مصرعہ اولیٰ مصرعہ برق ہے لیکن دوسرا شعر میں جو سوز اور
درد ہے۔ ذوق کے شعریں اس کا عشرِ عشر بھی نہیں۔ ذوق کو شمع کے ساتھ کوئی
سہمہ دی نہیں۔ وہ اُس سے بیگانہ دار خطاب کرتا ہے۔ اور اُس کے سوز و گداز سے
ایک معنوں پیدا کرتا ہے۔ اُس کے شعریں بزمیہ اور المیہ دونوں ایک جگہ جمع کر
نے کے ہیں۔ جس سے شاعر کی شمع سے بے تعلقی ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرا شعر عجم
المیہ ہے اس میں زور دیا جوش نہیں مگر شمع جو یہاں کائناتِ مہی کی نمائندہ ہے

Comedy and tragedy

کی حسرت ناک زندگی اور عبرتناک انجام کی تصویر ضرور کھینچ گئی ہے خود ذوق کے مداحوں سے پوچھا جائے۔ تو وہ تسلیم کریں گے۔ کہ اُستاد کا شعر فلانیہ ہے۔ اور اُسکے مدافع سے نکلا ہوا معلوم نہ رہتا ہے۔ دوسرے شعر کے متعلق قاری کو یہ شبہ نہیں گذر سکتا کہ سودا۔ ناسخ۔ اور داغ ایسے شاعریں ہیں جنہیں حقیقی شاعروں کی مانند جذبہ بہت کم طاری ہوتا ہے۔ اُن کی طبیعت میں گرم زجاجی اور مصنوعی جوش اس قدر ہے کہ نہ ایک رقیق القلب شاعر کی مانند جذبات میں ڈوب کر شعر نہیں کہہ سکتے۔ اور قاری محسوس کرتا ہے کہ شاعر عقل و شعور کی مدد سے شعر کہہ رہا ہے۔ ایسے شاعر کبھی عیاودانی شہرت حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اُنکی شاعری کا دار و مدار الفاظ پر ہے وہ فطرتِ انسانی کی تصویر نہیں کھینچتے۔ حقیقی شاعر جو کچھ کہتا ہے صدقِ دل سے کہتا ہے۔ اس لئے خواہ اسکی زبان ناقص ہی کیوں نہ ہو۔ اُس کی شاعری اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ غرض تنقید کا ایک نچتہ اصول صدقِ بیان ہے۔ اس کے بغیر انسان ایک حقیقی شاعر نہیں بن سکتا۔

جذبات و احساسات کیا ہیں! اور ان کا شاعری سے کیا تعلق ہے ایک نچب موضوع ہے۔ ہم یہاں اسکے متعلق مفصل بحث نہیں کر سکتے۔ اور چند اشکالات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہر انسان کا یقیناً زندگی خد اور اپنے جیسے انسانوں سے تعلق رہتا ہے۔ اس تعلق کا وہ مختلف طریقوں سے اظہار کرتا ہے۔ غور و تفکر جذبات و احساسات۔ اس ردِ عمل کی مختلف صورتیں ہیں۔ انسان کسی بات سے خوش۔ مغموم یا برا فردختہ ہوتا ہے۔ اگر یہ حالتیں زیادہ زور دار ہوں تو لازماً ان کا اظہار زور دار الفاظ میں ہوگا۔ غصہ میں انسان ہمیشہ ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ جن سے وہ عام حالتوں میں بچنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح ہر وہ کیفیت جو کسی عمیق یا شدید احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ زور دار ہو کر

خدیجہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اب جس طرح شدید غصہ یا خوشی کا اظہار دنیاوی معاملات میں غیر معمولی افعال سے ہوتا ہے۔ اسی طرح شعراء ادیب میں انکی ترجمانی زوردار الفاظ سے ہوتی ہے۔ اس لفظی تحریک کا نام رقص صوتی یا ترنم ہے جب یہ ترنم زیادہ نمایاں اور منظم صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تو اس کو وزن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ کہ عالم طبیعتیں حساس نہیں ہوتیں۔ ان کے جذبات اور کیفیتیں بادلوں کے سایہ کی طرح آتی ہیں۔ اور گذر جاتی ہیں۔ شاعروں پر ان کا اثر زیادہ پائیدار اور گہرا ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت جذبات سے اس قدر متغیر ہوتی ہے کہ وہ ان کے اظہار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس تحریک سے ان کا تخیل بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ اور ان کے احساسات کو محاکات کا جامہ پہناتا ہے۔ محاکات کوئی صلیبہ قوت نہیں۔ بلکہ تخیل کی ظاہری یا قریبی صورت ہے۔ جس کو نا واقف نقاد ایک جداگانہ تخلیقی قوت خیال کرتے ہیں۔

چونکہ شاعر کی طبیعت میں آہنگ اور توازن ہے۔ اس لئے اس کے احساسات دوسروں کی طرح بے ربط کلمات میں ظاہر نہیں ہوتے۔ وہ الفاظ کی ایک منظم صورت اختیار کرتے ہیں۔ بعض انسان ایسے بھی ہیں۔ جن پر کوئی شدید جذبات طاری نہیں ہوتا۔ وہ شعرا کا کلام پڑھتے ہیں۔ اور اکتساب سے اصول فن اور عروض کی واقفیت پیدا کر کے شاعری شروع کر دیتے ہیں ان کے جذبات اور خیالات لازماً مصنوعی ہوتے ہیں۔ ان کا اس البغاعت و سرو کے ناکہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ تیرہ شب کے پردہ میں سخن دزدی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ ایک مسمول شخصیت کے بغیر شعر کہتے ہیں۔ جو قریب قریب محال ہے۔ اپنی طبیعت کی گہرائیوں میں فوط زن ہو کر گویا بدست باہر نکلنا اور عام

لوگوں کی طرح خنزف چین لب ساحل نہ ہونا پس یہی صدق بیان ہے۔ جو
شاعری کا سب سے بُرا لوازم ہے

جبلی احساس اور خدا و قابلیت کے ساتھ ایک خاص نقطہ نظر بھی ضروری ہے
میر غالب، درد، اقبال اور انیس صرف اس لئے دوسرے شاعروں سے ممتاز
ہیں کہ وہ دنیا اور زندگی کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ سودا، مصحفی، انشا
ناسخ، اور دافع کا کوئی نقطہ نظر نہیں۔ اس لئے ان کا دل جذبات و احساسات
کی جولانگاہ نہیں بن سکتا۔ نقطہ نظر سے ہماری مراد زندگی کا نظریہ اور اس کے
ساتھ وہ تازگی نظر ہے جس کو عام طور پر تخیل کہا جاتا ہے۔ زندگی کا نظریہ یا
فلسفہ حیات اتنی عمیر الغمبات نہیں۔ ہر شخص دنیا کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے
دیکھتا ہے۔ یہی اسکا فلسفہ حیات ہے۔ اقبال کا نینت کو افراد کا مجموعہ خیال
کرتا ہے۔ اور دنیا میں ارتقاء کا عمل دیکھتا ہے۔ اُس کے نزدیک فطرت سر
ستاپا عمل ہے۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ سرگرم کار رہنا چاہئے۔ میر تقی میر پر فنا
کا نشہ طاری ہے۔ وہ دنیا میں کون کی نسبت خداد کے پہلو سے زیادہ متاثر
ہے۔ اس کے برخلاف ایک ریائی، بابر، عیش کو ش کہ عالم دوبارہ غیبت کے
مقولہ پر کار بند رہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ شاعر کا نقطہ نظر فلسفیانہ ہو
کیٹس کا نینت کے ہر ذرہ میں تجلیات حق کو برق آفرین بات ہے قیس علمی
ہر چیز کو ایک عاشق کی نظر سے لکھتا ہے۔ اور مولیر کا ذریعہ ہر واقعہ کو
ایک عرصے و مسک سرمایہ دار کی نگاہ سے دیکھتا ہے مختصر یہ کہ شاعر کیلئے
کوئی نہ کوئی نقطہ نظر ضرور ہونا چاہئے جس کے گرد اُس کے تمام خیالات

جذبات اور آرزوئیں گردش کریں۔ جب تک ہمارا دیدہ دل دنیا و مافیہا کو ایک خاص نگاہ سے نہ دیکھے۔ ہمارے دماغ میں نہ خیالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ نہ دل میں جذبات کی تحریک ہو سکتی ہے۔ اور ان کے بغیر شاعری کا لطف و اثر معلوم۔۔

نقطہ نظر کی دوسری صورت تازگی نظر یا تخیل ہے۔ اس کی تشریح کے لئے ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔ ہم اس پر یہاں کسی قدر تفصیل کیساتھ انہماک خیالات کرتے ہیں کیونکہ عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھا جاتا ہے تخیل صحیح معنوں میں ایک قوت ہے۔ جو انسان کو ظاہری قوتوں کی دراندیشیوں اور مجبوریوں کی تلافی کے لئے عطا کی گئی ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو ممکن الوجود مگر نایاب اشیاء کا تصور کرتی ہے۔ مثلاً جب ہم پرندوں کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم قدرت کا کسی ایسی چیز کا تصور کرتے ہیں جس کی مدد سے ہم ہوا میں پرواز کر سکیں۔ اسی طرح ہم نے کوئی بڑا سفر طے کرنا ہو تو ہم کسی ایسی چیز کا تصور کرتے ہیں جو ہمیں جلد منزل مقصود تک پہنچا دے۔ یہ ناممکن تو ممکن۔ نامموجود کو موجود۔ اور غیر مشہود کو مشہود بنانے والی قوت تخیل ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو ہمیں فیاض قدرت نے وقت فاصلہ۔ اور دیگر موانع و مشکلات کی تسخیر کے لئے عطا کی ہے۔ تخیل ہمارے ذہن میں ایسے واقعات۔ اشیاء اور مخلوقات کا تصور پیدا کرتا ہے جو خارج میں وجود نہیں رکھتے۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ اشیائے قدرت ہی کو ہماری آنکھوں کے سامنے نئے نئے رنگ اور نئی نئی صورتوں میں پیش کرتا ہے۔ اس کا کام ہماری محدود عناصر کی سنگین دنیا میں انجمیت اور وسعت پیدا کرنا ہے۔ شیکسپیر نے درست کہا ہے کہ شاعر کی آنکھ

لطیف و شگفتی۔ اور المیت کے نشے میں سرشار زمین سے آسمان اور
 آسمان سے زمین کی طرف گھومتی ہے۔ اور مہم لقورات کو نام اور مقام بخشی
 ہے۔ یہی قوت ہے۔ جو ہولی کو صورت اور تخیلات کو پیکر محسوس عطا کرتی ہے
 جتنا کسی شاعر کا تخیل بلند ہوگا۔ اتنا ہی وہ اچھوتی چیزوں کا ادراک کریگا
 شیکسپیر حیرت انگیز افراد کا تصور کرتا ہے۔ بلکن ابلنس کی عجیب غریب
 شخصیت تخلیق کرتا ہے۔ اور اکثر ادیب ایسے ہیں جو اشیائے قدرت برائی
 اور نفوس بشریہ کے اچھوتے تصور پیش کرتے ہیں۔ بعضوں میں یہ طاقت بھی
 ہوتی ہے۔ کہ اشیاء کے خواص اور افراد کے اطوار و خصائل کو چشم
 زدن میں بھانپ لیں۔ یہ سب تخیل کی ندوات کا ریاں ہیں۔ جتنا کوئی شاعر
 صاحب تخیل ہوگا۔ اتنے ہی اُس کے لقورات بلند ہوں گے۔ لقورات
 سے ہماری مراد حقائق و معارف نہیں۔ یہ ثقیل چیزیں فلسفہ سے متعلق
 رکھی ہیں۔ اور تخیل کی دنیا سے باہر ہیں۔ اسرار خودی و ربوہ و خودی۔
 و گلشن راز و حیدر۔ ایک فلسفی کی مخلوقات فکر ہیں۔ شاعرانہ تخیل سے
 ان کا تخیل بہت ضعیف ہے۔

تخیل ان مراحل کو ایک ہی جست میں طے کر لیتا ہے۔ جن کو عقل ساہر
 سال کی کوششوں کے بعد بھی نہیں پہنچ سکتی۔ عقل کا کام غور فکر ہے۔
 اور تخیل غور فکر نہیں کرتا۔ بلکہ وہی طور پر محسوس کرتا ہے۔ اس سے ظاہر
 ہے کہ عقل کیوں تخیل کی پرواز کو نہیں پہنچ سکتی۔ عقل بے پروا بال۔
 مگر اس جہد انسانوں سے مشابہت رکھتی ہے۔ جو انتہائی کوشش کے
 باوجود ہوا میں پرواز نہیں کر سکتے۔ تخیل اپنے پروں کی ایک ہی جنبش پر
 سبک پرواز پرندوں کی مانند ہوا میں بلند ہو جاتا ہے۔ تخیل اشیاء کو

مختلف صورتوں میں دیکھتا ہے۔ اور ان میں التباس وارتباط پیدا کرتا ہے
یہ اشیا میں ایسا پیوند نہیں لگاتا جس کو ہر نظر محسوس کر سکے۔ وہ ان کو
آپس میں مربوط اور ضم کرتا ہے۔

چنانکہ خود شناسی کہ از گنج پویست

یہی وجہ ہے کہ شعر استعارہ اور کنایہ کو اس قدر استعمال کرتے ہیں
استعارہ دو چیزوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ اور ایک وسیع منظر یا مطلب کو
مختصر پیر میں ادا کرتا ہے۔ اسی طرح کنایہ ایک وسیع معنوں کی طرف
تلمیح یا اشارہ کر کے اس کا ایک ایک نکتہ قاری پر واضح کر دیتا ہے
یعنی تخیل کا طریق اظہار القا کی طرح سربلج ہے۔ نثر خیالات اور واقعات
کو بیان کرتی ہے۔ شاعری کا اسلوب غیر بیانہ ہے بیشک پیسیر یہ نہیں
کہتا کہ زندگی میں تذبذب تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ اس موضوع پر
سعدی کی طرح طول لیول و عطف نہیں کرتا۔ بلکہ جھلک جیسی زندہ خواب وید
تشکیل کچھ کہ اپنا مفہوم واضح کرتا ہے۔ صائب کا ایک شعر ہے

صائب چو سرو آزادیم از فکر بہشت

درد دل ما جانباث کو ثروت سینم را

اقبال بھی اس شعر پر کوئی ترقی نہیں کر سکا۔ اور واعظانہ لہجے میں

گویا ہے کہ

ماخذ ہولینگ (Lesson) کی مشہور تصنیف لوکان (Lacan)

ہمیں شاعری اور مصوری کے متعلق بحث کرتا ہے ہم اسکی تمام آراء کو درست تسلیم نہیں کرتے
بلکہ شاعری اور مصوری کے متعلق اسکی بعض باتیں بہت پر معنی ہیں جو

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے سیخبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

غائب کا لطیف اسلوب یہ ہے ۷

تانیفتہ ہر کہ تن پر وہ بود
خوش بود گردانہ بنو دام را
ہم کو معلوم ہے حبت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غائب یہ خیال اچھا
طاعت میں تا ہے نہ سے دانجیس کی لاگ
دورخ میں دل کو کسی لبیکر بہت کو
کیا زہ کو مانوں کہ نہ ہو گر چہ ریائی
پاداشِ عمل کی طرح غام بہت ہے
گاہ یہ غلہ امیدوار کہ نہ حجیم ہیناک
گر چہ خدا کی یاد ہے کلفت ماسوا سمجھ
ان اسالیب کا ذوق کے انداز کے ساتھ موازنہ فرمائیے ۷

کب حق پرست زائد حبت پرست ہے
عروں پر مرنا ہے یہ شہوت پرست ہے
اشارہ یا تلخیص سے مطلب ادا کرنے کے لئے تعظیم کا یہ شعر ملاحظہ ہو
اس طرح اونچے پہاڑوں میں گہری میاں دیا
جی طرح دیوؤں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں
یہ الفاظ ایک طعنے کی مانند ہم پر ساحرانہ اثر رکھتے ہیں ان سے گویا پرستان کا
دروازہ کھل گیا ہے۔ ہمارے بچپن کے تمام تصورات سینما کی مکمل فلم بن کر آنکھوں
کے سامنے آ جاتے ہیں۔ پانی کی یہ زندہ تصویر بلا خط ہو۔

خاموش پانی
چلتا مچلتا
پہلو بدلتا
بہتا بہتا
چمکے گنگنا تا

چپ ہے نپا تھر

تاروں کا دفتر

کینے کے اندر

حیاتِ گرانی فاموش پانی

کیا یہ چار پانچ مختصر فقرے اکبر کے غیر مختتم اور ست رگ آپ لوگوں سے زیادہ مؤثر نہیں؟ اسی طرح راشد و جیدی کا یہ نفیس شعر ملاحظہ ہو۔
وہ حینت جس میں حوریں جھم جھما جھم رقص کرتی ہیں۔

کبھی پاؤں اٹکھاتی ہیں کبھی پاؤں کو دسرتی ہیں
حوریں ادا ان کا رقص کس نے دیکھا ہے۔ مگر شاعر کا کمال دیکھ کر اس نے
ایک مصرعہ سے اُن کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر دی ہے۔ ہم اُن کے گانے
کی آواز اور رقص کی جھم جھما جھم صاف طور پر محسوس کرتے ہیں۔ چند الفاظ
نے حُسن کی ایک حیرت انگیز دنیا آشکار کر دی ہے۔

یہاں تک ہم نے تجیل کے اعلیٰ درجے واضح کئے ہیں۔ شاعر کا تجیل چھوٹی
باتوں میں بھی دلپندیر کیفیتیں پیدا کرتا ہے۔ تاخیر کا ایک شعر ہے۔

مجاہدیں بھر بھر کے لارہی میں سیاہ شکنیزے بادلوں کے
تو دوشِ ترکِ فلک پہ توں فزع کی زنجیں کماں لہی ہو

دوسرا مصرعہ ایک گنڈ نشتر ہے۔ لیکن مصرعہ ادنیٰ حقیقی محضوں میں تیج تیز
ہے۔ یہ مصرعہ صرف ایک حقیقی دالہیت اور شوریدگی کے نشے میں سرخار
شاعر کے قلم سے نکل سکتا تھا۔ کما کوئی قافیہ اندیشِ منشاعر اس قسم کی
نرالی تشبیہ کا تصور کر سکتا ہے؟ خیالات میں سرورِ مسلم۔ مگر تصورات تو
خاص شاعرِ دل کا حصہ ہیں۔ شاعر نے ایک طفل کی چشمِ پاک میں سے محسوس
کیا۔ کہ آسمان پر اڑنے والے چھوٹے چھوٹے کالے بادل سیاہ شکنیزے
ہیں۔ جن کو ہوائیں سمندروں سے بھر بھر کر لارہی ہیں۔

اختر شیرانی وہ میخانہ سخن کا رنر لاؤ ہالی لکھتا ہے۔ اور کتا خوب

رکھتا ہے۔ کہ ح

یہ بجلی ہے کہ اک مرم کی ناگن و حضوئیں کی جمیل پر لہراہی ہے
مرم کی ناگن اور دہوئیں کی جمیل اکتنا جبارت آئینہ خیال ہے۔ اسکی تعریف
کے لئے بختوری مرحوم کے خاتمہ رنگیں لٹکار کی ضرورت ہے۔

تخیل اور بھی بہت سی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس کے سب سے
بڑے کام وہی ہیں۔ جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ یہ ایک قسم کی تازگی نظر ہے۔ جو
لوگ اس سے بہرہ مند نہیں وہ کبھی پر عظمت شاعر نہیں بن سکتے۔ یہ بھی یاد رہے
کہ فارسی آئینہ شاعری ضروری نہیں کہ ٹھیلانہ ہو۔ محنت سخی اور قطع طرازی فہم و فراست
کے غیر فردوسی اشجد کا پھل ہیں۔ طوبی و سدوہ کے جگر گوشے نہیں! انکا عاثر
یعنی فلسفہ کے مرد میدان بہت کم ہیں کہ انکا تخیل سے بہرہ مند نہ ہوں۔
یہاں اس محنت کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ فلسفیانہ شاعری کی
شوکت دیکھا کہ اس کو رفعت تخیل سے منسوب کرنے میں بہت احتیاط سے کام
لینا چاہئے۔ ہمارے اکثر نقاد اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ فلسفہ اور تخیل
ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ درحقیقت دونوں میں زمین و آسمان
کا فرق ہے۔

یہ تو واضح ہو چکا کہ شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت شاعری
شخصیت کو حاصل ہے۔ اس کے بعد فن کا مطالعہ ضروری ہے۔ فن کے
معنے شاعری یا کلام نہیں۔ اگرچہ ہمارے یہاں اس کو انہی معنوں میں استعمال
کیا جاتا ہے۔ فن سے مراد شاعر کا طرز بیان۔ اسلوب اور تعمیری قوت
ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے برکھارت اور نقاشا طر امید پر نظمیں تحریر
فرمائیں۔ نظمیں کیا ہیں۔ اچھے خامے قعیدے یا جوابے مضمون میں بندش

درست۔ خیال سنجیدہ۔ اور زبان بھی فاضلہ شستہ اور رفتہ ہے لیکن کیا یہ شاعری بھی ہے؟ یہ کیفیت وصف نگاری اور اجزا شمار کی اس مقدس نام سے موسوم نہیں کی جاسکتی۔ آزاد اور انجیل میر تقی میر کی قسم کی نظمیں لکھنے کے عادی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر انسان محسوس کرتا ہے۔ کہ ان جہ گوں کو شعر کہنے کا سلیقہ نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان منظومات میں تخیل اور لطیف جذبات کا فقدان ہے۔ یہ نظمیں تعمیری قوت۔ مذاق نقیصہ۔ طرز بیان۔ اور اسلوب کے لحاظ سے بھی دقیق نہیں۔ شاعروں کا لہجہ مخالفا نہ ہے۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری کو لیجئے۔ اُن کے خصوصیات انہما میں مشابہ نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ آپ نے اپنے عہد کے ہر واقعہ اور ہر بات پر خوب محنت جینی فرمائی۔ مگر یہ کون تسلیم کر لے۔ کہ حسن۔ لطافت اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اُسکی شاعری غالب اور اقبال کی شاعری کی مانند آسمان رفتہ ہے۔ اکبر کو جس بات نے مشہور کیا۔ اُن کی زبردست شخصیت ہے۔ فن کے لحاظ سے انکی شاعری بلند پایہ نہیں۔ اسی طرح اقبال کی طویل نظمیں ہدایت ناقص۔ اور غیر مربوط ہیں۔ سنا کہ غائب آپ کی سب سے زیادہ کامیاب طویل نظم ہے۔ اسکے اخیر میں آپ نے خواب شکوہ کا مضمون شروع کر دیا ہے۔ اور شکایت کی بجائے اُلٹی خدا سے صلح کر لی ہے۔ ”طلوع اسلام“ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے اشعار کہنے عمارت کے سنگ و خشت کی مانند بے ربط اور بے تکیں ہیں۔ جاوید نامہ کا موضوع کیا ہے؟ ایک خواب۔ اور اس میں بیان کیا گیا ہے جو شاعر کا اپنا فلسفہ کیا شاعری دام عنکبوت اور کہانی فیض لقا پر دونوں بے آمیز چیزیں ہیں۔ اور ان کو اکٹھا کرنا ایک بڑی فنی غلطی ہے

اس تنقید سے ہمارا مقصد مرغانِ بلند آشیان کے نشیمن پر کلونگ اندازی نہیں۔ صرف اتنا ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ نقد فن کے معنی کیا ہیں۔ ہمارے یہاں فن کو محض شاعری کی لفظی خوبیوں اور برائیوں کا اصطلاحی نام خیال کیا جاتا ہے۔ یہ غلط فہمی آج بھی ہمارے نقادوں کو گمراہ کر رہی ہے اس لئے اس پر بھی چند سطریں حوالہ قرطاس کی جاتی ہیں۔

شاعری کی زبان کا درست ہونا اُسی طرح ضروری ہے۔ جس طرح فن اور مذاق ضروری ہیں۔ اگر کوئی شاعر زبان کے محاورہ کی بلاوجہ پیڑی نہیں کرتا۔ تو کلام اُس کی شاعری میں ایک ایسا عیب پیدا ہو گا جس سے اُس کی جاذبیت میں بہت فرق آجائے گا۔ شعر کیا ہے؟ حسن و لطافت کا ایک نظر فرب محبت۔ اگر اس محبت پر کہیں کہیں خراشیں پیدا ہو جائیں تو وہ ضرور نظر آشوب ثابت ہوں گی۔ اس لئے شاعر کو زبان کے استعمال میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ارباب تنقید کا حق ہے کہ وہ شاعروں کی زبان اور اصول فن کی خلاف ورزی پر اعتراض کریں۔ مگر اعتراض کو مرتب کرتے وقت اُن کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تنقید کے حقیقی فرائض کیا ہیں؟ ہمارے خیال میں تنقید کے فرائض سے ناواقفیت ہی وہ بات ہے جس نے ہمارے نقادوں کو گمراہ کر رکھا ہے وہ شعر کی شخصیت اور فن کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اور صرف شاعری کو موضوع بحث بنا لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کلام کے محاسن و معایب بھی لائق مطالعہ ہیں۔ مگر اُن کی اہمیت ثانوی ہے۔ جب ہم شاعر کی افتاد مزاج، عادات و خصائل اور فن کے مطالعہ سے فارغ ہو جائیں۔ تو کلام کی خوبیوں اور برائیوں پر بھی نظر ڈالی جاسکتی

ہے۔ لیکن اُس کی شاعری کو دیکھتے ہی ظاہری خصوصیتوں پر سے
 فے کرنا اور مین میکھ لکنا لٹا۔ بجا نہیں۔ تنقید کا پہلا اصول یہ ہونا
 چاہئے۔ کہ شاعر کو ادائے جذبات میں پوری پوری آزادی دی جائے
 اور اُس پر بلاوجہ پابندیاں نہ عاید کی جائیں۔ اگر وہ اپنے مذاق اور
 طبیعت کی پیروی کر کے درست شعر کہتا ہے۔ تو کیا ضرورت ہے کہ
 اُس کے راستے میں قواعد و ضوابط کے کانٹے بچھا کر رکاوٹ پیدا کی جائے
 افسوس ہے کہ ہمارے نقاد تنقید کرتے وقت ان باتوں کا خیال نہیں
 رکھتے۔ وہ ہمدردانہ مطالعہ سے نا آشنا ہیں۔ اور یہی تنقید کا سب
 سے بڑا اصول ہے۔

ایک انگریز نقاد لکھتا ہے۔ کہ ادیبوں کی غلطیوں پر خوش ہونے
 والے فرد کو تاح نظر میں۔ بھلا ان لغزشوں اور غامیوں میں رکھا ہی کیا ہے
 قادیان۔ ادیبوں کی غلطیوں میں بھی ایک نفاست۔ ایک لطافت اور
 دلآویزی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ماہر فن غلطیوں کے باوجود ہماری توجہ کو
 برقرار رکھ سکتا ہے۔ تو معمولی غلطیاں اُس کی عظمت پر اثر انداز نہیں
 ہو سکتیں۔ ادیبوں کی واحد کمزوری مذاق کی لپستی ہے۔ اگر اُن
 کا مذاق درست ہے۔ تو ان کی لغزشیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

سہارن پور لائبریری (Robert Lynd) اس کا دلچسپ مضمون
 (In Praise of Mistake) یعنی غلطیوں کی تریف اس قدر اہم ہے۔ کہ
 اس کا مطالعہ ہمارے برہم و غلط نقادوں کے لئے نہایت ضروری ہے

آخر ہر ادیب سے لکھتے وقت کوئی نہ کوئی لغزش ہو ہی جاتی ہے۔
 بالخصوص طویل معنائیں اور تحریرات میں جہاں ادیب کو صد ٹا
 مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کا دماغ مسلسل غور و فکر
 سے ٹھک جاتا ہے۔ اس قسم کی معمولی فروگذاشتیں کثرت سے سرزد
 ہوتی ہیں۔ اہل تنقید کو ان تقصیفات کی ادبی و فنی خصوصیات پر زیادہ
 توجہ دینی چاہئے۔ اور معمولی باتوں سے قلیع نظر کر کے اپنی عالی ظرفی
 کا ثبوت دینا چاہئے۔ جو غلطیاں اتفاقاً سرزد ہوں۔ قابل گرفت نہیں
 البتہ ایسی خامیاں جو مصنف کے نقص طبیعت کا نتیجہ ہوں۔ واقعی قابل
 اعتراض ہیں۔ کیونکہ ان کی اصلاح بہت دشوار ہے۔ یہ بھی دیکھنا ضروری
 ہے۔ کہ شاعر عمدہ اعلیٰ کا ارتکاب کر رہا ہے۔ یا سہواً۔ بسا اوقات
 قویٰ عہد زبان اور اصولی فن کا ذوقی یا فنی ضروریات سے تقابل ہو
 جاتا ہے۔ اور شاعر کو ان میں سے ایک کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ ایسے
 مقامات پر اگر کوئی ادیب سلسلہ اصولوں سے انحراف کرے تو یہ
 اس کی صلاحیت کی بین دلیل ہے۔

ایک اور بات جو اس سلسلہ میں یاد رکھنی چاہئے۔ شاعری کی مہم

اے گئے لکھتا ہے کہ طویل نظم لکھنا مشکل ترین مہمات میں سے
 اس کے لئے بجد محنت اور تماری کی ضرورت ہے بشعرا کہ بہت سوچ بچائے بعد
 طویل منظومات پر طبع آزمائی کرنی چاہئے۔ لمبی نظموں میں اکثر مقامات ایسے آتے ہیں
 جہاں شاعری کا جادو کارگر نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے ایڈیٹرا میں پونہ لکھا ہے کہ در
 اصل طویل نظم کوئی وجود نہیں لکھتی۔ یہ مختصر نظموں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

زبان ہے۔ حکما نے مغرب کی تحقیق ہے کہ شعر اپنا اثر الفاظ کے مہمسم استعمال اور خیال انگیزی سے بھی پیدا کرتا ہے۔ شاعری ایک قسم کی شاعری ہے۔ حسن۔ ترنم۔ اور نظریہ شخص۔ بہت۔ انجذاب۔ توجہ کے مختلف ذریعے ہیں۔ اسطرح قدیم طرز کے تعجب انگیز الفاظ مہمسم ترکیبیں۔ اور بعض اوقات مہمل جملے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ تاکہ مخاطب پر ایک خاص اثر پیدا کیا جائے۔ اس لئے جو نقاد شاعری کی ان خصوصیتوں کو نہ سمجھتے ہوئے تنقید کے اھولوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یا لعموم صحیح نتائج پر نہیں پہنچتے۔ بلکہ پایہ نقادان کے موقوعہ محل کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ اور قابل تعریف معلومات ہم پہنچاتے ہیں۔

اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے ہم پھر اس بات پر زور دیتے ہیں۔ کہ نقاد کو ہمیشہ شخصیت اور فن کے مطالعہ پر توجہ دینی چاہئے۔ شعر و ادب کا اولین مقصد خیالات کا اظہار ہے۔ اس لئے ان خیالات کا مطالعہ اور سب باتوں پر مقدم ہے۔ ظاہری صورت یا کلام محض ایک پیرایہ اظہار ہے۔ اہل چیز وہ نفسی کیفیتیں اور عقائد ہیں جن کو ایک ادیب دوسرے انسانوں کے فائدے کے لئے قلمبند کرتا ہے۔ ہمیں قدیم شاعروں اور نقادوں کی اس غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہئے

Hypnotism. ۱

۲ ولیم مورس (William Morris) کی ایک نظم کا یہ تکراری ٹکڑ۔
Two red roses upon a tree.
بالکل بے معنی ہے۔ مگر یہ اثر نہیں۔

کہ تمام توجہ صورت پر مبذول کر کے معنی سے بالکل بے پرواہ ہو جائیں۔ جب شعر وادب کا مقصد ہی شخصیت کا اظہار ہے تو اس کو چھوڑ کر ان کی ظاہری خصوصیات کا مطالعہ کرنا ان کی اہلی غرض و غایت سے ناواقفیت ظاہر کرتا ہے۔

اب تک ہم نے جس قدر باتیں بیان کی ہیں۔ مرثیہ۔ غزل۔ قصیدہ اور سہدس تمام اصنافِ سخن پر عادی ہیں۔ اگر یہ اصناف اس معیار پر پوری اُتریں تو ان کے محاسن و معایب پر سبیرانہ نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ آجکل ہمارے یہاں ایک خاص قسم کا تغزل مروج ہے۔ جو تمام تر قدیم اردو شاعری کی صدائے بازگشت ہے اس میں حقیقی جذبات کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اور قدیم رنگ کے پیش پا افتادہ خیالی مضامین کثرت کے ساتھ قلب بند کئے جاتے ہیں۔ زبان بھی لہذا نہایت مبتذل اور فرسودہ ہے۔ اس قسم کی شاعری معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ اس لئے اس کے محاسن و معایب پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ جدید قسم کی مصنوعی نظمیں بھی پایہ اعتبار کو نہیں پہنچتیں۔ اس لئے ان کا وقت نظر سے مطالعہ کرنا نمک سے لعل و گہر کی تلاش ہے۔ اگر معیار ہی رہا نہیں ہوتا۔ تو جدید شاعری ہو یا قدیم تغزل۔ دونوں کی خوبیوں اور برائیوں کی توضیح سعی لا حاصل ہے۔

اصنافِ سخن کو پرکھنے کے خاص اصول

ظاہری امور کے معنوی خصائص پر غائب ہونے کی وجہ سے اردو شاعری کی اصناف عام اصنافِ سخن کی وضع و ہیئت سے بہت مختلف ہو چکی ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے نقادوں کو ان پر تنقید کرتے وقت مصرعہ بالا اصولوں کو استعمال کرنے میں بہت الجھن ہوتی ہے۔ اور وہ گہرا کہہ دیتے ہیں۔ کہ شرقی شاعری کو مغربی معیار سے پرکھنا ناممکن ہے۔ اس سے بھی زیادہ دقت

یہ ہے کہ ان اصنافِ کلام کو اب تک انکی نوعیت کے مطابق ظاہری اصولوں ہی سے پرکھا گیا ہے۔ ہمارے نقاد ان کے نقائص کو ظاہر کر کے غلو میں بیان کے بنیادی اصول کے مطابق نئے فروعی اصول وضع کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سطور ذیل میں ہم یہ نئے اصول مرتب کر کے دکھاتے ہیں۔ کہ تعمیری تنقید کی روش کیا ہونی چاہئے۔

۱۔ یہ صنف کسی خاص معنوی ضرورت کا نتیجہ نہیں۔ اور صرف اسلئے **قصیدہ** ظہور میں آئی کہ شعرا کو امر اور نہی کی مدح معقود تھی اس سے ظاہر ہے کہ قصیدہ حقیقی جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا۔ یہ محض شاعروں کی قوتِ تحریر اور لیاقت کے اظہار کا ذریعہ ہے بشرق میں اہل سخن کی معنی سے بے تعلقی اور صورت سے وابستگی ان کو براہِ راست مسائل، اغراق، صنعت پرستی، اشکال اور تخیل کی طرف لے گئی۔ اسلئے ہم دیکھتے ہیں کہ قصائد میں نہ انتِ شبستگی، معنی مضامین و محانی، موزون تخیل اور سنجیدہ عبارت معقود ہیں۔ قصیدہ کی ہیئت میں کوئی معقول اصول کار فرما نہیں۔ قدیم امین تنقید کی رو سے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ قصیدہ شاعری کا ایک اہم جزو ہے اور اس سے شاعر کی استعدادِ شعری ظاہر ہوتی ہے۔ جو شخص قصیدہ کہہ سکتا ہے ایک مسلم الثبوت ہے۔ نہیں تو اس کا کمال فن ہرگز قابلِ تسلیم نہیں۔

قصیدہ گلِ محمدی کا قدیم معیار۔ بھی کسی معقول اصول کے مطابق نہیں اعلیٰ تشبیب خصوصاً بہاریہ تشبیب قصیدہ کا زیور ہے۔ اس کے بعد مثنوی خوش اسلوبی سے گزیر ہو۔ اتنا ہی قصیدہ بلند پایہ ہے۔ مدح میں جس قدر بیان ہو۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اشکال، صنائع و بدائع، اغراق، بے مزہ الفاظ غیر شگفتہ تحریر، درشت و سنگلاخ زمینیں اور بے سرو پا مضامین اس کا

مائیے ناز و متاعِ افتخار میں۔ آخر میں جس قدر حمد و تحسین کی درازی عمر اور افزونی جاہ و مال کی دعا ہو۔ شاعر کے جس کلام اور شاعرانہ تہارت کا بدیہی ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں تنقید میں جتنی بھی علمیت ظاہر کی جائے۔ اور قولوں کلمات کا اظہار ہو۔ محسن ہے۔

جدید نقطہ نظر سے یہ عقاید اور معیار درست نہیں۔ اب قدیم شعرا کے قصیدے محسین کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ اور نہ قصیدے کو معیار لیاقت یا شاعری کا ایک اہم جزو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں شاعر کو اپنے کلمات اور علم و فضل کے ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر یہ خوش اسلوبی سے ادا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر نہ ہوں تو عبارت غیر مطبوع بن جائے گی۔ قصیدہ کو دیگر اصنافِ سخن پر کوئی ترجیح نہیں۔ اُن کی طرح یہ بھی ایک پیرایہ بیان ہے۔ اگر یہ شاعری کے معیاری اصولوں پر چڑھتا ہے۔ تو لائقِ مطالعہ ہے۔ اگر نہیں تو خواہ یہ سلاطینِ صالحین کی تصنیف ہو۔ خواہ کسی محاصرہ کا شکار ہو۔ قلم۔ ادبی حیثیت سے اس کی کوئی وقعت نہیں۔

ہر نظم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحریر اور معنی کے لحاظ سے شاعری کے فطری اصولوں پر پوری اترے۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اشعار میں شاعر کے حقیقی جذبات کا پرتو ہو۔ اس شرط کے مطابق اُس میں وحدت اور تسلسل لازم ہے۔ صدق بیان کے لحاظ سے ہمارے قصائد معیار پر پورے نہیں اترتے اگر شاعری واقعی زندگی کی تنقید ہے۔ تو قصائد کو شعریت کے دعوے کی

سے حالی مرحوم نے جذبات پر زور دیا۔ لیکن قصیدہ کی ہیئت تبدیل نہ فرمائی۔ یہ اُن سے بڑی کوتاہی ہوئی۔

دستبرد ہو جانا چاہئے۔ چونکہ ان میں شاعر کے حقیقی جذبات کو کوئی دخل نہیں اس لئے ان کو فطری شاعری نہیں قرار دیا جاسکتا۔

صداقت اور وحدت و تسلسل کے بعد صرف دو باتیں رہ جاتی ہیں۔ جن کی نو سے قصائد کو پرکھا جاسکتا ہے۔ لطف معنی اور حسن تحریر لطف معنی سے ہماری مراد ہر قسم کے مضامین ہیں۔ جو کسی نظم میں قلم بند کئے جاسکتے ہیں۔ مختلف قسم کے مطالعہ معانی، تخیل اور تشبیہات و استعارات قصائد کا معنوی سرمایہ ہیں۔ قافیاں نے اپنے قصائد میں وہی مضمون قلم بند کئے ہیں۔ جن کو دوسرے قصیدہ نویس قلم بند کرتے ہیں۔ مگر اُس کے کلام میں حقیقی شاعری کا رنگ نظر آتا ہے کیونکہ اُس کی طبیعت شاعرانہ ہے۔ اور اُس کے کلام میں شگفتہ تخیل کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اُس کے یہاں تشبیہات، استعارات اور لطف مضامین کی کثرت ہے۔ اسی طرح عرقی اور غالب کے قصائد میں تخیل اور تخیل کے ساتھ گونا گوں مضامین و معانی ہیں۔ عرقی تشبیہ میں تصوف کے روحانی مسائل اور حقائق و معارف نظم کرتا ہے۔ اس طرح وہ قصیدہ جیسی اپنے صنف کو بھی حقیقی شاعری سے روشناس کرتا ہے۔ یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ شاعر نے قصیدہ میں بھی اپنی شخصیت کی نفی نہیں کی۔

منوچہری نے اپنے قصائد کو قدرت کی رنگینوں سے مزین کیا ہے۔ یہ مہاسن تو یکسو۔ اگر مدح و ستائش کے مبالغہ آمیز مضامین کو پشتگی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا جائے پھر بھی قصائد قارئین کی تفریح خاطر کا سامان بن سکتے ہیں۔ غرض صدق بیان، وحدت و تسلسل اور لطف معنی وہ حسبِ اہل ہیں۔ جن کی محکمہ ہم قصائد کی معنوی اصابت کا امتحان کر سکتے ہیں۔

حسنِ تحریر کے لحاظ سے قصیدہ پر اپنی اہل لوگ اطلاق ہوتا ہے جو دیگر اصنافِ سخن کو پرکھنے کیلئے استعمال

میں لائے جاتے ہیں۔ بھرت، جوش اور عدمِ تعلق اعلیٰ شاعری کیلئے ضروری ہیں۔ صنائع و بدائع بھونڈی اور درست نہیں ہیں اور اشتغالِ مہایت میری ہیں۔ اب قصیدہ کو پرکھنے وقت دیگر ارقاقی اور عروض کے تمام اصولوں کا استعمال چاہئے۔

یہاں یہ بات بھی لائق بیان ہے۔ کہ قصیدہ میں اعلیٰ تخیل کے استعمال کی گنجائش بہت کم ہے۔ کیونکہ اس کا میدان نہایت محدود ہے۔ چونکہ اس میں جذبات کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے تخیل کو مرتعش ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ شاعر اپنی عقل، فہم و فراست اور تخیل سے کام لے کر شعر کہتا ہے۔ اس لئے وہی شاعر عمدہ شعر کہہ سکتا ہے۔ جس کا مذاق اچھا ہو۔ جو شخص اعلیٰ قوت تحریر کا مالک ہے۔ وہ اچھا قصیدہ لکھ سکتا ہے۔ لہذا اگر قصیدہ میں صرف تحریر ہی کی غویاں ہوں۔ تو بھی وہ مطالعہ کے لائق ہے۔ اس بنا پر قصیدہ میں حسن تحریر پر جن قدر زور دیا جائے۔ بھڑ ہے۔ اگر کسی قصیدہ میں سے یہ اہم جزو نکال دیا جائے۔ تو اس میں کوئی حاذپ نظر خصوصیت باقی نہیں رہتی۔

یہ وہ جدید اصول ہیں۔ جن سے قصاید کو پرکھنا چاہیے۔ اگر قدیم شاعری کے مدح ان کو درست نہیں مانتے۔ اور مبالغہ کو ایشامی شاعری کی جان قرار دیتے پراسرار کرتے ہیں۔ تو وہ ایک ایسا دعوے کرتے ہیں۔ جس کی تائید میں کوئی معقول ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں شاعری کا ان کی فطرت اور اس کی باطنی و خارجی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ عقلی صنعتیں۔ فوق العادہ مضامین اور محض لغظاتی۔ عقل اور تخیل کا بے بنیاد طلسم ہیں۔ ان میں تخیل کی دلاویزی اور جذبات کی شوریدگی نہیں پائی جاتی۔ اس لئے مبالغہ آمیز پر تکلف قصاید کو شاعری کی قلمرو میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ ان کا تعلق سمجھیں اور تاریخوں کے ساتھ ہے۔ جو بالکل عقلی اور تخیلی چیزیں ہیں۔ اگرچہ وضع و ہیئت کے لحاظ سے قصیدہ پھر بھی ایک ادبی چیز ہی کہلائے گا۔

ہمارے قدیم طرز کے نقادوں کی ایک اور دلیل کی تردید بھی ضروری

معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے اکثر نقاد خیال کرتے ہیں۔ کہ قصاید کی ادبی وقعت اُن کی تعداد پر منحصر ہے۔ اگر ایک شاعر کے قصیدے دوسرے سے کم ہیں۔ تو اُن کی ادبی قدر و قیمت بھی اسی نسبت سے کم ہے۔ اصلیت خواہ کچھ ہو۔ یہ طرز استدلال صریحاً ناقص ہے۔ کسی نظم کا ادنیٰ یا اعلیٰ ہونا شاعر کی قوت بیان۔ تخیل اور دیگر ملکات شعری پر منحصر ہے۔ اس لئے جو شخص اعلیٰ قوت تحریر رکھتا ہے۔ ایک ادنیٰ شاعر سے ہمیشہ بہتر شعر کہے گا۔ خواہ وہ ایک یا دو شعر ہی کہے۔ شاعر کا ذائقہ ایک شعر۔ ایک مصرع سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ دو تین میر حاصل قصیدے تو صاحب نظر نقاد کے لئے ایک دفتر سے کم نہیں۔ غرض جدید نقاد اس قسم کے قدیم طریق موازنہ کی درست نہیں خیال کرتے۔ اور قصاید کا مقابلہ اُن پر معنی اصولوں سے کرتے ہیں۔ جن کو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔

ہجو | ہجو بھی قصیدہ کی ہمداد ہے۔ یک پردہ پست ترکا فرق ہے۔ اور بس۔ ایک طرف مبالغہ آمیز تعریف ہے۔ تو دوسری طرف بے انتہا تذمیم۔ ہمارے یہاں ہجو عموماً شخصی ہوتی ہے۔ شاعر دوسروں کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے نظم کہتا ہے۔ سودا کی ہجویں بہت مشہور ہیں۔ مگر جدید مذاق ان سے فرحت اندوز نہیں ہوتا۔ ان میں کسی قسم کی لطافت یا عاذیت نہیں ملتی جلتی۔ اہل مغرب تے ہجو کو بھی اصلاح کا ذریعہ بنا یا ہے۔ اور اس کے مفہوم کو بہت وسعت دی ہے۔ وہ اس سے سوساٹھ کے نقائص کو دور کرتے ہیں۔ اور اخلاقی دمایم کی اصلاح کرتے ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ سیاسی مذہبی اور ادبی معاملات میں بھی ہجو کو اصلاح کا آلہ کار بناتے ہیں۔ ہماری زبان میں شستہ ہجو آج نے رائج کی۔ اگرچہ اس کی اس حدت سے ہمارے نقاد بالکل بیخبر

ہیں۔ عالی کے بعد اکبر نے دشمنہ و خجراتھ میں لیا۔ اور بھوکو اس قدر ترقی بخشی کہ
 یہ چیز انہی کے نام سے منسوب ہو گئی۔ تعجب ہے کہ ہمارے نقاد اب بھی بھو
 کو ایک شخصی چیز تصور کرتے ہوئے اس کا اطلاق اکبر کی طنزیہ شاعری پر نہیں
 کرتے۔ جس کا مایہ ناز یہی اخلاقی۔ سیاسی اور ملی امور کی بھوک ہے۔ اصل کلام
 یہ کہ بھو اپنی بدترین صورت میں افراد و اشخاص کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور
 اس صورت میں نہایت معیوب اور قابل نفرت ہے۔ لیکن اگر اس صورت
 میں بھی اس کا اسلوب نکتہ سنجاہ اور بھوک کی وہ معقولات ہو تو اس کو گوارا کیا
 جاسکتا ہے۔ غالب کے بعض اشعار نہایت لطیف بھو پر مشتمل ہیں مثلاً ۵
 بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہوا ترانا و گرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
 میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق خزا ہوتا ہے
 اور معذرت ٹیک ایسی لطیف بھو یہ نظم ہے کہ اردو میں اس کے پایہ کی کوئی چیز
 نظر نہیں آتی۔ اس قسم کی بھو یہ نظمیں کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ
 ان میں شاعر خواہ مخواہ کسی پر زہر نہیں اگلتا۔ بلکہ مجبور ہو کر تعریضی کلمات
 زبان پر لاتا ہے۔ اور اس کا مقصد بکرا اخلاقی اور فطرت انسانی کی معیوب
 خصوصیتوں کی مذمت ہے۔ مختصر یہ کہ بھوکے لئے جدید نقادوں کا معیار
 شستگی ہے۔ اگر کوئی نظم اس معیار پر پوری نہیں اترتی تو وہ دغور تو جہ نہیں *۔

مرثیہ مرثیہ کو قدما ایک قسم کا قصیدہ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں
 متونی کی خوبیوں کی تعریف کی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس
 کو ایک علیحدہ صنف قرار دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ مزدوری نہیں۔ کہ مرثیہ میں
 صرف متونی کے فضائل و مکارم بیان کئے جائیں۔ یہ تو ایک فریاد ہے۔ جو
 اعزہ و اقربا کو فنا ہونے دیکھ کر ہمارے لبوں سے نکلتی ہے۔ مرثیہ میں کی

آج کل بہت تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ اور شہدائے کربلا کی بجائے مختلف قسم کے انسانوں کے مرثیے دیکھنے میں آتے ہیں۔ مثلاً مرحوم نے اس کے لئے جو اصول تنقید بتائے ہیں۔ ان کی عام تنقید کی مانند بہت سطر درختہ بند ہیں۔ متوفی کی خوبیاں بیان کر دینے سے مرثیہ نہیں بن سکتا۔ مانا کہ اس میں کسی قدر غم کا اظہار بھی کر دیا گیا۔ لیکن اس قسم کا اظہار غم بھی بے لطف اور غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ مرثیہ کے معنی، سوز، شکایت اور فریاد ہیں۔ خواہ یہ باتیں کسی رنگ میں ظاہر ہوں۔ اگر اس کو فلسفہ سے گراں بار کر دیا جائے یا شکایت کی جگہ تسلیم و رضا کا لہجہ اختیار کیا جائے تو مرثیہ کا اصلی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرثیہ میں تغزل کی زبان کا استعمال بھی بے محل ہے۔ کیونکہ عاشقانہ اور حزنِ لہجہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ اعلیٰ قابلیت کے شاعروں کے لئے یہ تضاد بھی کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتا۔ غالب نے عارف کا مرثیہ غزل ہی میں لکھا۔ اور کامیاب رہا۔

غزل | غزل بھی اب تک قدیم اصولوں کی آستان بوسی پر ناز کرتی ہے۔ غزل کو ہر کھتے وقت ہمارے نقاد زبان۔ عود صنی اور الفاظ کی صحت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس صنف میں وہ مفرد اشعار پر زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور ان کی بندش۔ صنایع بدایع وغیرہ کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ زمین کی ناہمواری۔ قافیہ کی نادرستی۔ حروف کی تکرار۔ شعروں کی اچھائی یا برائی۔ مرقع فصاحت و بلاغت اور اشعار کی تشریح پر سارا زور قلم صرف کرتے ہیں۔ اور معنوی امور کو دھیان میں نہیں لاتے۔ تعجب ہے کہ ہمارے ادیبوں نے یہ *Rigid* اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ" میں اسی وجہ سے ناکام رہی ہے

تنقیدی ہے عنایاں دیکھ کر بھی اصلاح کا ہاتھ نہ اٹھایا۔ حالی نے غزلیات پر بہت عمدہ تبصرہ کیا۔ لیکن تنقیدی اصولوں کو بہتر بنانے کی کوشش نہ فرمائی بعد کے نقادوں نے قدیم شعرا کے کلام پر معقول تنقید کی بالخصوص بجنوری مرحوم جس نے تنقید کا انداز ہی بدل دیا۔ مگر ان واقف کار حضرات نے بھی جدید اصول فن منضبط نہ فرمائے اور غزل کا سفینہ بدستور آوارہ و پریشان رہا۔ موجودہ نقادوں نے بھی اس اہم کام کی طرف توجہ نہیں کی۔ عبد القادر سروری راسم بالو سبکدہ۔ سید عبداللطیف آرس اور غلام محی الدین زور نے جدید اصول استعمال کئے۔ لیکن کامیاب ہوئے تو صرف اس قدر کہ حدت میں بھی قدامت کی روح پیدا کر دی۔

غزل کے جدید اصول تنقید واضح کرنے سے پہلے ہم ایک بار پھر صدق بن اور شخصیت کے بنیادی اصولوں پر زور دینا چاہتے ہیں۔ غزل میں ان چیزوں سے عموماً قطع نظر کر لی جاتی ہے۔ اور شعرا کی مقصد کے بغیر داؤ غزل دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے نقاد کو غزل پر نظر ڈالتے وقت نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اگر غزل گو شاعر صدق انہار سے کام نہیں لیتا اور اس کا اپنا نقطہ نظر یا شخصیت کوئی نہیں تو اس کے تمام شاعرانہ دعوے اور لاف سخن گسری بے سود ہیں۔

مداقت بیان کے بعد دیکھنا چاہیئے کہ شاعر کہاں تک اپنے جذبات اور عقاید کی پیروی کرتا ہے۔ اور کہاں تک قافیہ کا دست نگر ہے۔ غزل کی ساخت ہی ایسی ہے۔ کہ شاعر بالعموم ماوراء راست سے دوڑ جا پڑتا ہے۔ غزل کا انحصار

قافیہ پر ہے اس لئے شاعر غزل کہتے کہتے نادانستہ قافیہ کا سہارا لینے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس عادت کی وجہ سے وہ بھول جاتا ہے کہ قافیہ کو اس کی طبیعت کا تابع ہونا چاہیئے۔ ادنیٰ شاعر غزل کی گمراہ کن ساخت سے بہت جلد راہ راست پر گھڑا ہو جاتے ہیں۔ وہ شاعری کو الفاظ و زلفاظ لفظی کا تحسین خیال کرتے ہیں۔ اس سے ان کا کلام پر تصنع بن جاتا ہے۔ اچھی غزل وہی شاعر کہہ سکتا ہے جس کی شخصیت اس قدر پر شوکت اور زور دار ہو کہ وہ قافیہ کو بھول کر اپنے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرے۔ لیکن چونکہ غزل کی آسان و سادہ فریب میٹت ہر اونٹنے والے شاعر کو شعر گوئی کی دعوت دیتی ہے۔ اس لئے ہر موزوں طبیعت شخص اس کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اور معترضین کو موقع دیتا ہے۔ کہ وہ غزل کو پر تصنع قرار دیں۔ غزل اپنی ساخت کی وجہ سے مصنوعی شاعری کو اس قدر فروغ دیتی ہے کہ اب اس کا ترک کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس صنف میں بہت کم شاعروں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور کامیاب شاعروں نے بھی اس تنگنائے سخن کو بہت مشکل سے عبور کیا ہے۔ غزل کی ساخت نے ان کی شاعری میں بھی بہت سا تصنع پیدا کر دیا ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں غزل پر تنقید کرتے وقت دیکھنا چاہیئے کہ شاعر قافیہ کے دیکھ کو مسخر کر رہا ہے۔ یا خود اس کے چنگل کا شکار ہو گیا ہے ؟

اگر غزل شاعر کے حقیقی جذبات کا مرقع نہیں۔ تو اس کی شاعری لازمی طور پر رسمی اور مصنوعی ہے۔ اس پر تصنع شاعری میں حقیقی جذبات۔ فطری مہناتیں۔ مفید معانی و مطالب اور شگفتگی بیجا جلوہ نہیں ہو سکتے۔ ان کی جگہ غیر خوش آئند زینوں۔ بھونڈے الفاظ۔ غیر موزوں تراکیب۔ رکیک و نحیف تصانیع۔ غیر مطبوع صنایع و بدایع اور ہر قسم کی بد عنوانیاں نظر

امیں گی۔ نقاد کو غزل پر نقد و نظر کرتے وقت دیکھنا چاہیے کہ شاعر کا میلان جذبات کی طرف ہے یا عبادتِ اُمرانی کی طرف ؟

غزل اپنی طویل زندگی میں بہت سی رسمی خصوصیتیں پیدا کر چکی ہے۔ اس کے معنائین شعریہ۔ استعارے۔ تشبیہیں معنائی اور ہیئت مقرر ہو چکے ہیں۔ اُن سے سجادِ شاعری کے معایب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اہل لکھنؤ نے غزل در غزل۔ صنعت پرستی۔ طولانی غزلوں اور دیگر ناموزوں خصوصیتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا مقررہ معنائین کو الفاظ کے اُلٹے پھیرے مختلف صورتوں میں پیش کرنے لگے۔ تازگی اور ہمت بالکل مفقود ہو گئے۔ حالی نے غزل کے ان نقایص کو محسوس کیا۔ اور اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن روایاتِ قدیمہ کا اثر اس قدر شدید تھا کہ اُن کی کوششیں پنجاب کے علاوہ اور کہیں مشکورانہ ہوئیں۔ بلکہ اس آزاد صوبہ میں بھی جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکیں۔ اہلِ نجان تو اب بالکل غزل ہی کے ہو رہے ہیں۔ اور اس صنف کو روز بروز پست سے پست تر بنانے میں سعی بلیغ کرتے ہیں۔ خیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ قدیم شاعروں میں جس قدر پُر تصنع شاعری کی علامات کم ہوں گی۔ اُسی قدر اُن کی شاعری فطری شاعری کے قریب ہوگی۔ ناقدانِ فن کو دیکھنا چاہیے کہ شاعر کہاں تک روایاتِ کہن کی قید سے آزاد اور کہاں تک رسوم و قیود کا باندہ ہے۔ بلند پایہ شاعر غزل کی ان خرابیوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادس نے شاعرِ جان بوجھ کر ان کو اپنے کلام میں داخل کرتے ہیں ؟

اگر کوئی شاعر واقعی صاحب ذوق ہے۔ تو اُس کے کلام اور طبیعت کا مطالعہ تنقید کا ایک خوشگوار فرض ہے۔ مضامین۔ بیان۔ طبیعت۔ ملکات۔ افکار۔ شخصیت۔ لب و لہجہ۔ تخیل اور موزون طبع سب پر مبصرانہ نظر ڈالنی چاہیئے تاکہ اُس کا ظاہر و باطن ہم پر کف خورشید کی مانند روشن ہو جائے۔

غزل کے اشعار میں قافیہ و ردیف کے سوا کوئی ربط و تعلق یا رشتہ اتحاد نہیں۔ سب کا مضمون جدا جدا ہے۔ اور کسی واحد جذبہ۔ کیفیت یا خیال سے وابستہ نہیں۔ یعنی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت انتشار ہے۔ اس میں تسلسل کا التزام نہیں کیا جاتا۔ اور جب تک کوئی شاعر کسی خاص موضوع کو پیش نظر رکھ کر یا کسی خاص جذبہ کے زیر اثر غزل نہ کہے۔ اُس میں کسی قسم کی وحدت نہیں پائی جاتی۔ اگر کچھ وحدت ہے۔ تو ظاہری وضع و ہیئت میں۔ مسلسل غزلوں کا رواج صحیح معنوں میں جدید ادبی تحریک کے ساتھ ہوا۔ اس لئے اگر قدیم شعرا کے کلام میں کوئی مسلسل غزل پائی جائے تو یہ اُس کی ایک خوبی تصور کی جائے گی۔ لیکن اس مسلسل غزل کو شبلی مرحوم کی طرح ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ جب تک شاعر عادتاً یا التزاماً تسلسل سے کام نہیں لیتا۔ اُس کی اتفاقی مسلسل غزلوں کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ معمولی موضوعات پر مسلسل غزلیں بھی ادبی حیثیت سے وقیع نہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی عمدہ خیال یا جذبہ ضرور ہونا چاہیئے۔ مسلسل غزلیں بہت کم کامیاب ہوتی ہیں۔ غالب اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر اس حیثیت سے کامیاب ہوں تو ہوں۔ عام شاعر اس کمان کو زہ نہیں کر سکتے۔

پریشان گوئی کے ساتھ تضاد بھی ضرور ہے۔ غزل میں یہ عیب بہت

پایا جاتا ہے۔ شاعر کو جو خیال ذہن میں آئے یا اس کو قافیہ سے سونہے وہ بلا تکلف نظم کر دیتا ہے۔ اس سیربطی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غزل مختلف خصوصیتوں اور مضمونوں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ غزل میں یہ خصوصیت صدیوں کی تبدیلیوں اور زمانہ گردیوں کے بند پڑا ہوئی۔ پہلے یہ ایک مفرد چیز تھی۔ اب مرکب بن گئی ہے۔ پہلے ایک سیدھی سادی عشقیہ نظم کی پنکھڑی تھی۔ اب مختلف خصوصیات اور مطالب و معانی کا گلدستہ بن گئی ہے۔ عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف، فلسفہ، اخلاق، پسند و نصیحت، ظرافت، سیاسیات اور معاشرتی امور نے اس کے ظرف کو فراخ کر دیا ہے۔ اور اب اس کی عمدگی کا معیار متفرق مضامین کی موجودگی ہے۔ یہ معیار بڑی حد تک درست ہے۔ چونکہ غزل کے ہر شعر کی اچھائی یا برائی اسی تک محدود ہے۔ اس لئے کسی غزل میں جتنے اچھے شعر ہوں گے۔ وہ اسی قدر بلند پایہ تصور کی جائے گی۔ غزل کی ہیئت، وہ خارجی وحدت یا یکسانیت پیدا کرتی ہے۔ جس سے وہ ایک نظم کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اشعار کی بلندی دافلی وحدت پیدا کرتی ہے۔ اس لئے یہ اندرونی وحدت جس قدر زیادہ ہوگی۔ اسی قدر غزل کا مرتبہ بلند ہوگا۔

خیالات غزل کی عمدگی کا انحصار بجائے پر ہے، مغربی شاعری میں تخیل کی مسلسل پرواز دکھائی جاتی ہے۔ اور لمبی لٹیں تحریر کی جاتی ہیں۔ وہاں شاعری کی روح تشریح یا تفصیل ہے۔ اس میں ہر مضمون کو پھیلانے کا بیان کیا جاتا ہے۔ اور نظم کے موضوع کو ایک وسیع پیرائے اظہار بخشنا جاتا ہے۔ غزل کی روح جمعیت ہے۔ شاعر ہر ایک شعر پر اپنی تمام قوتوں کو مرکز کرتا ہے اور اپنے پیرائے بیان کو تا جحد امکاں۔ موجز اور مضمون کو وسیع عمیق

بنا تا ہے۔ تاکہ اُس میں بلا غبت پیدا ہو جس طرح آفتاب عالم کتاب اپنی شعاعوں کو خبزم کے نفع سے بیتاب قطرہ میں مجروح غم کرتا ہے۔ اُسی طرح شاعر اپنی طبیعت کی تجلیوں کو ایک شعری رگ میں برقی تپاں بنا کر دوڑاتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ غزل مجموعی حیثیت سے دلچسپ ہو۔ اور اُس میں جذبات و مضامین عالیہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوں۔ اگر اردو اور فارسی کی بہترین غزلیاں کو پرکھا جائے۔ تو معلوم ہو گا کہ ان میں وہی غزلیں زیادہ مشہور ہیں جن میں اجمال کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ لمبی غزلوں میں خواہ مخواہ وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ غزل کی سرشت کے خلاف ہے۔ لمبی غزلیں بہت کم کامیاب ہوتی ہیں غزل در غزل اسی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ غزل میں قافیہ سارا اور بھرتی کے اشعار زیادہ ہونے سے اُس کے وقار میں فرق آ جاتا ہے۔ ایک ابھی غزل میں دس یا زیادہ سے زیادہ پندرہ شعر ہونے چاہئیں۔ یہ صرف اسی صورت میں اعلیٰ درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اشعار کی کثرت سے اس کی جمعیت قائم نہیں رہتی یہ ایک قسم کی نظم بن جاتی ہے جس کی خصوصیات اور ضروریات غزل سے بہت مختلف ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود بہت ممکن ہے کہ کوئی قادر الکلام شاعر لمبی غزلیں لکھنے میں کامیاب رہے۔ کیونکہ مافوق الفطرت قابلیت کے لئے ہر بات ممکن ہے۔

تمام اچھی غزلیں ایک مجموعی اثر رکھتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہمیں میز و نیت کا احساس ہوتا ہے۔ جتنی کسی غزل میں خامیاں ہوں گی۔ اتنا ہی اُس کا اثر ہلکا ہو گا۔ یہی استدلال ظاہری و باطنی خوبیوں پر بھی صادق آتا ہے۔ غزل جتنی ہموار اور شستہ ہو گی۔ اتنا ہی اُس کا اثر زیادہ ہو گا۔ اس لئے غزل کی زمین شگفتہ زبان لطیف۔ پیرایہ بیان دلچسپ اور مضامین

ملہ یعنی چونچ یا مرکب

اعلیٰ و موثر ہونے چاہئیں۔ بعض نقاد زمینوں کی شگفتگی پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ یہ درست ہے۔ کہ ذی استعداد شاعر ہر زمین میں اچھے شعر نکال سکتا ہے لیکن اس طرح اچھی غزل بننے کے امکانات بہت کم ہیں۔ ہم اساتذہ کے دواہن کی صرف انہی غزلوں کو پڑھتے ہیں۔ جن کی بھریں اور زمینیں شگفتہ ہیں۔ جو چیز ہماری نظر کو پہلے ہی غیر خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔ اس سے اچھا اثر مترتب ہونے کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے؟ اس کے علاوہ مشکل یا مکروہ زمینیں شاعر کی طبیعت کو اجازت نہیں دیتیں کہ وہ بلند پروازی کی شان دکھا سکے۔ لفظوں کے گورکھ ہندسے میں پھنس کر وہ شاعری کی عام سطح سے اوپر نہیں اُبھر سکتا۔ جو کہ غزل کا مجموعی اثر معایب کی کمی پر موقوف ہے۔ اس لئے اس میں تصنع۔ تکلف۔ مبالغہ و تخیل۔ بھونڈے الفاظ۔ ثقالت اور ناگوار مضامین جس قدر زیادہ ہوں گے۔ اُسی قدر اُن کا اثر ماند پڑ جائے گا۔

غزل کی عمدگی شاعر کے حسن تخیل۔ جذبہ و کیف۔ اور لطف بیان پر بھی منحصر ہے۔ یہ سب باتیں اُس کے مجموعی اثر میں اضافہ کرتی ہیں۔ تغزل کے لئے جذبات کی اشد ضرورت ہے۔ سادہ جذبات کو ترنم کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے۔ اس لئے عشقیہ غزلیات میں لطف بیان۔ سادگی اور موزونیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس وجہ سے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ غزل میں تصنع یا سخاوت نہ ہو۔ تکلف اور سو قیّت کی خفیف سی جھلک بھی تغزل کے لطف کو برباد کر دیتی ہے۔ اکثر قدیم شعرا اور موجودہ اہل زبان کے کلام میں یہی نقص ہے۔ وہ زبان کے با محاورہ ہونے پر بہت زور دیتے ہیں۔ اور اپنی زبان دہانی کے انہار کے لئے ریک و سبک محاورات۔ کہاوتیں۔ ضرب المثلیں اور بھونڈے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جن سے اُن کی شاعری نہایت ناگوار

بن جاتی ہے۔ ادبی حلقوں میں امیر اور داغ کی شاعری کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن ان کی زبان میں تہذیب اور متانت کہاں؟ مسلسل نظموں میں تشبیہات۔ استعارات اور تراکیب وغیرہ آسانی سے لائی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ ان میں شاعر کو یہ دقت نہیں ہوتی کہ وہ ایک ہی مختصر شعر میں ایک وسیع مضمون کو ادا کرے۔ غزل میں حالت برعکس ہے۔ شاعر اس میں کھل کر بات نہیں کر سکتا۔ لہذا جو شاعر اس کے محدود میدان میں بھی جولانی طبع دکھا سکتا ہے۔ اور اس میں اعلیٰ تخیل۔ تراکیب۔ تشبیہات اور استعارات پیدا کرتا ہے۔ عام شاعروں سے زیادہ احترام کا مستحق ہے۔ ضرورت سے زیادہ جمال۔ ابہام اور پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ جب کسی طویل مضمون کو صرف ایک شعر میں قلمبند کیا جائے۔ تو ضروری ہے کہ شاعر انتہائی حریف و شہکار سے کام لے۔ اس سے شعر میں تنقید پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پُر تکلف تخیل کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ مثنوی، گلزارِ نسیم، اسی نقص کی وجہ سے جدید ادب کو پُر تصنع معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے شعر کا دستور ہے۔ کہ غزل میں ہر قسم کے مضامین قلمبند کریں۔ خواہ انہوں نے اس کا واقعہ میں احساس کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ داغ بعض اوقات تصوف کے شعر کہہ جاتا ہے۔ لیکن کیا وہ درحقیقت ایک صوفی تھا؟ اس کی ہوا پرست طبیعت کو تصوف سے کیا مناسبت؟ اسی طرح دیگر اردو شعرا بھی خیالی باتیں نظم کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری کا مطالعہ احتیاط سے کرنا چاہیئے۔

چونکہ غزل میں ہر قسم کے متفرق مضامین ادا کئے جاتے ہیں۔ اس لئے قدیم شعرا کی غزلیات، پرتبصرہ کرتے وقت، یہ بھی دیکھا جائیگا۔ کہ ان کے مضامین

میں کس قدر تنوع ہے۔ یعنی اُن میں شوقی سنجیدہ ظرافت۔ ہجو۔ جوش اخلاق۔ فلسفہ۔ تصوف اور ایسی قسم کے اور مضامین کتنی قسم کے ہیں۔ تنوع شاعر کی عظمت کی ایک بڑی نشانی ہے۔

ہر بلند پایہ شاعر صاحب طرز ہوتا ہے۔ اُس کا کلام بڑھ کر ہمیں ایک خاص شخصیت کا احساس ہوتا ہے۔ غزل کے ذریعہ سے شخصیت اور واقعات زندگی کا اظہار بہت مشکل ہے۔ بہت کم شاعر آپ بیتی اور نفسی حقائق کو غزل میں ادا کر سکے ہیں۔ اور بہت کم ہیں جو معنوی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیادہ تعداد اُن شاعروں کی ہے جو غزل کی بنیاد ظاہری باتوں پر رکھتے ہیں چونکہ ظاہری خصوصیات کی دلچسپی ہنگامی ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کو جاودانی شہرت نصیب نہیں ہوتی۔ بقائے دوام صرف انہیں برگزیدہ ہستیوں کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اپنی شاعری میں کوئی نہ کوئی داخلی خصوصیت پیدا کرتی ہیں۔ غالب نے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا۔ رومی نے تصوف کے قالب میں شاعری کی روح پھونکی۔ حافظ نے دار و ادب قلبی کی مصوری کی۔ شیکسپیر نے فطرت انسانی کے صدف رنگ جلوے دکھائے۔ اور دانٹے نے عجیب و غریب مشاہدات کی حیرت انگیز تصویریں پیش کیں۔ چونکہ ان کی تحریرات اب بھی ہمارے لئے فائدہ مند ہیں اور انسانی فطرت اور زندگی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے یہ کبھی فنا نہیں ہو سکتیں۔ اگر مروجہ نے اپنے عہد کے حالات پر تنقید کی۔ شبلی نے سیاسیات کو اپنا موضوع بنایا۔ اور خوب ولولہ انگیز نظمیں لکھیں۔ اُن کے زمانہ میں یہ نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔ کیونکہ ان کا اس عہد کی زندگی اور انسانوں کے ساتھ بارہ و ساغر کا تعلق

مختار یہ ایک سیال جو ہر اور وہ صورتگانہ خمیازہ کا مصداق تھے۔ مگر اب
 نہ وہ سسے رہے ہیں۔ نہ وہ زندانِ قدحِ نوش، اس لئے اکبر اور شہلی کی
 مقبولیت بہت کم ہو گئی ہے۔ ان امور سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف
 لفظی یا کاغذی شاعری کب تک اپنے آپ کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ سرمدیہ دور
 تسلیم کرے گا۔ کہ شعرا کے کلام کو زندہ جاوید بننے کے لئے کسی اہم موضوع
 کے ساتھ رابطہ استوار پیدا کرنا چاہیئے۔ خواہ اہل سخن شاعری میں اپنی شخصیت
 کا اظہار کریں۔ خواہ فطرت انسانی، زندگی اور کائنات پر سنجیدہ و پرمعنی تنقید
 کریں۔ داخلیت کی موجودگی ضروری ہے۔ اگر موضوع غیر اہم ہوگا۔ تو شاعر
 کبھی بقائے دوام حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوگا۔ داغ کی ہلاکت انسانی
 اور زندہ جذبات۔ اگر ان کو زندہ جذبات کہا جاسکے۔ عمر برق و شرار
 رکھتے ہیں وہ مفقود معنا چرائے رہلزار باد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مومن کے
 عشقیہ تجربے اور سفلیہ خیالات انسانی فطرت کا درد و کدز پیش کرتے ہیں۔
 ان سے اعلیٰ شاعری کے اخلاق افروز اور فرحت بخش اثرات کی توقع نہیں
 کی جاسکتی۔ معاملہ بندی۔ عامیانہ شاعری کی نورالعین دامن ہے۔ اور ذوق
 اس کو پرگاہ کی بھی اہمیت نہیں دیتا۔ حفیظ اور راشد و حمیدی بھی تو
 عاشقانہ واردات نظم کرتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ سو قیمت کی گردان کی
 شاعری کے دامنِ تقدیر کو چھوئے پائے۔ انشاء۔ جبرائیل۔ مومن اور دیگر
 اہل زبان جب دھم سے آکھوں گا۔ صاحب سلام میرا، اور میں کو چہ
 رقیب میں بھی سر کے بل گیا، سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کی محبت راشد
 کی بے لوث محبت نہیں۔ جو کہتا ہے۔ اور خوب کہتا ہے کہ
 بھتی ہو میں تم کو رسوا کروں گا؟
 تمہاری محبت کا چرچا کروں گا؟
 کبھی عشق کا راز افشا کروں گا؟

مجھے تم سے ایسی محبت نہیں ہے

قدیم طرزِ سخن کے پرستار محاورہ اور سادگی کے دلدادہ ہیں۔ دنیا کے بڑے شاعروں نے محاورہ کی کبھی پروا نہیں کی۔ اگر کوئی محاورہ اچھی طرح ادا ہو جائے۔ تو خیر۔ ورنہ وہ یہ کوشش نہیں کرتے۔ کہ محاورات کو اپنی شاعری میں کھپائیں۔ ذاتی طور پر ہم محاورہ کی اس خاص صورت کے بہت خلاف ہیں۔ جس کی جمع محاورات ہے۔ مثلاً ماتھے پہ آنکھیں رکھنا۔ باؤ کے گھوڑے پر چڑھنا۔ جل دینا۔ الماس کے ٹکینے توڑنا۔ چپے بٹے۔ کوک اہو نار۔ مچر مچر چیلنا۔ آگ کی نہ دھک۔ بھر بھرانا۔ یہ محاورات گویا بنے بنائے اوزار ہیں۔ جن کو شاعر طبیعت پر زور ڈالے بغیر استعمال کر دیتا ہے۔ دوسرے ان میں شستہ عبارت اور شاعرانہ متانت کی شان نہیں پائی جاتی۔ شعر و ادب میں ایسے الفاظ کی ضرورت ہے۔ جو حسن و لطافت کے ٹکینے ہوں۔ اور صد پہلو ہیروں کی مانند ان کی معنویت کے متعہ درخ ہوں۔ جو مل جل کر ہر دہ چشم پر قوس قزحی کیفیت پیدا کریں۔ چونکہ محاورات ایک محدود معنوں کی مجازی علامت ہیں۔ اور متانت کی بجائے دکاکت کی طرف مایل ہیں اس لئے سلیم الغفرت شاعران سے ہمیشہ احتراز کرتے ہیں۔ خیر۔ ایک بحث طلب سوال ہے۔ لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ شاعری میں اس قسم کے خرف ریزوں کا استعمال مذاق کی پستی ظاہر کرتا ہے۔

درست محاورہ وہ ہے۔ جس کو روزمرہ کہا جاتا ہے۔ اس سے کوئی شخص اجتناب نہیں کر سکتا۔ کیونکہ زبان کی ساخت ہی اس

پر منحصر ہے۔ لڑتا بھڑتا۔ قلع قمع۔ غول کے غول۔ پھونک پھونک کر
 قدم دھرتا۔ تاب لانا۔ کس شمار میں ہے۔ قریب قریب۔ جلد از جلد
 شبہ یا کلام ہونا۔ مجھے جانا ہے۔ جوں توں کر کے اور اس قسم کے دیگر
 سوارے زبان کی روح و رواں ہیں۔ ان کے بغیر زبان کی ہستی برقرار
 نہیں۔ اس لئے ان کا استعمال ناگزیر ہے۔ اور کوئی سمجھدار شخص ان
 پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ مگر سناؤنی سنانا۔ گل پھولنا۔ چھاتی پر مونگ
 دلنا۔ بلم ٹیری۔ اُلٹی زقند بھرنا۔ بک جھک۔ بیاہا ٹھایا۔ تانا بانا
 ہونا۔ جی کے اندھے وغیرہ ان ناقص ادیبوں کا مال و متاع ہیں
 جو تخلیق اور غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

جذبہ باقی شاعری میں سادگی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ہر قسم
 کی شاعری میں اس کا التزام ناممکن ہے۔ ادق مضامین اور نفسیاتی
 واردات کو ادا کرنے کے لئے مشکل الفاظ اور اسلوب کی ضرورت
 ہے۔ اگر کوئی شاعر تاؤر و کلام ہے۔ تو وہ جس طرح چاہے۔ کسی مضمون
 کو ادا کر سکتا ہے۔ شعری نفاست اپنے اشکال کا جواز آپ پیش کرے گی۔
 کون کہہ سکتا ہے۔ کہ غالب کے ان اشعار کا مشکل ہونا بلا ضرورت
 ہے۔

ہا و جو دیک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ہیں چراغانِ شبتانِ دل پر واندہم
 محفلیں برہم کئے ہے نجفہ باز خیال ہیں ورق گردانی نیرنگ یک ستارہم
 رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے

بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
 شعرا پر بلا وجہ پابندیاں عاید کرنا تنقید کا تنزل ہے۔ سادگی شاعری کے لئے لازماً

نہیں قرار دی جاسکتی۔ جب یہ خصوصیت موضوع یا مضمون کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اور اس کا اضافی ہونا ناگزیر ہے۔ تو پھر سادگی کا شور و غوغا قطعاً لا حاصل اور بے معنی ہے۔

بعض نقاد شاعر کی عظمت کا دور و مدار اچھے شعروں کی تعداد پر خیال کرتے ہیں۔ یہ طریق تنقید بھی درست نہیں۔ اگر میرے یہاں بہتر سے بھی زیادہ نشتر ہوں۔ پھر بھی وہ میر ہی رہے گا۔ غالب نہیں بن سکتا۔ اچھے شعروں کی کثرت سے شاعر کا خیال زیادہ بلند نہیں ہوتا اور دماغ کی فطرت یا دائرۂ سخن میں دست پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ہم نے محض کسی شاعر کے کلام کو پرکھنا ہو۔ تو بلند اخعار کی کثرت کا معیار کچھ معنی رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ پھر بھی ہمیں درست نتائج پر پہنچنے میں مدد نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے کہ دماغ اور مومن کے یہاں میر سے بھی زیادہ اچھے شعر نکل آئیں۔ لیکن وہ ان اشعار کی بنا پر اس سے بہتر شاعر نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ شاعر کی عظمت کا انحصار اس کے مذاق۔ خیالات معنوی افادیت۔ رفعت تخیل اور طبیعت کے نمونے پر ہے۔ اور سب باتوں کو جانے دیجئے۔ اگر کوئی شخص ہزار ہا اچھے شعر کہتا ہے۔ مگر ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ اس کا مذاق درحقیقت بہت بہت ہے۔ تو ہم اس کو بڑا شاعر تو کیا ایک چھ شاعر بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ آتش کے بہت سے شعر مزب المثل بن چکے ہیں۔ لیکن کیا وہ حقیقتاً صاحب ذوق تھا؟ انشائی غزل کرنا بند ہے ہوئے چلنے کو یاں سب یا رہیٹھے ہیں۔ بڑے بڑے نقاد اسے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ مگر کیا وہ واقعی ایک بلند پایا شاعر تھا؟ کیا اس کی فطرت سلیم تھی؟ کوئی نقاد اس کو ایک اعلیٰ شخصیت کا مالک تسلیم نہیں کرتا۔ مانا کہ شاعر کے منتخب اور برگزیدہ شعر ایک حد تک اس کا شاعرانہ مرتبہ ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن صرف

اشعار پر تنقید کی بنیاد رکھنا، ظاہر کرتا ہے۔ کہ ہم محض، کلام کی خصوصیات سے ایک خاص نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ طریق ہمیں کبھی درست انتقادی نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔ میر کو اس کے بہتر نشروں نے بڑا نہیں بنایا۔ وہ ایک خاص شخصیت ہمالک ہے۔ ماہر فن ہے۔ اور اس کی شاعری میں بعض خوبیاں ہیں۔ ان سب باتوں کی موجودگی نے اس کا پایہ بلند کر دیا ہے۔ صرف کلام کی خوبیاں اس کی عظمت کا باعث نہیں بنیں۔ شاعری کی ظاہری خصوصیتوں کی وہ لیل راہ بنا نا غلط روی کا پیش خیمہ ہے۔ یہی بات ہے۔ جس نے حاتی جیسے راستہ رد کو بھی رستہ بھلا دیا آپ فرماتے ہیں۔ یہ بھی معلوم رہے۔ کہ شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاسکتا ورنہ فردوسی و نظامی دونوں مثنوی میں اور رازی و عاقانی دونوں قصیدے میں مسلم الثبوت استاد نہیں ٹھہر سکتے۔ کیونکہ اذری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی بہ اعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے عاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ حالانکہ چاروں شخص فارسی کے رکن رکن مانے جاتے ہیں۔ پس لازم ہے کہ جدا جدا معیاروں سے جانچنے جایں۔

یہ اس بارے میں غور کرنا ہو گا کہ قلم سے جو جدا جدا شاعری اور تنقید کا موسس

اعلیٰ ہے۔

اگر مولانا حاتی فردوسی۔ رازی۔ نظامی اور عاقانی کا مقابلہ شخصیت اور فن کے لحاظ سے کرتے تو وہ اس قدر شدید غلطی کے مرتکب نہ ہوتے۔ ان کے ہم عصر شبلی اور آزاد بھی اسی قسم کی طفلانہ غلطیوں کا شکار ہوٹ میں اول اس کا سبب یہی ظاہری خصوصیتوں کی پیروی ہے۔ اگر وہ در نظر

رو در نظر کے مقیاس پر کار بند ہوتے تو اس قدر گمراہ نہ ہوتے ۔

فارسی کے ان مقتدر شعرا کا مقابلہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کے مزاج ، خیالات اور مقاصد کا مطالعہ کیا جائے ۔ فردوسی انسانوں کے جذبات ، مناظر قدرت ، زندگی اور رزم و بزم کے نقشے کھینچتا ہے ۔ اس کی شاعری پر تنقید افسانہ کے اصولوں کے ماتحت ہوگی ۔ وہ ہوتر کی مانند ایک مشکل کام کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اس لئے اس کی عظمت ان شاعروں سے بہت زیادہ ہے ۔ جو ادنیٰ کاموں میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ خیام اور عطار کو فردوسی سے کچھ مناسبت نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ وہ محدود حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور اس کا دام سمین تخیل آفاق گیر ہے انوری اور خاقانی د محرم کے لحاظ سے فردوسی کا مقابلہ کر سکتے ہیں ۔ نہ مقصود شعر اور منتہائے نظر میں اس کے حریف ہیں ۔ ان کی دنیا آبجیواں کی مانند دنیا کی نظروں سے مستور ہے ۔ اس کو چاہنے والے بہت کم ہیں ۔ فردوسی کی دنیا ایک روشن دنیا ہے ۔ جس کا ایک زمانہ مداح ہے ۔

نظامی اور فردوسی کا مقابلہ بھی آسان ہے ۔ فردوسی انسانی شعوبہ کا راز داں ہے ۔ وہ قدرت کا تذکرہ آٹکھ سے مطالعہ کرتا ہے ۔ اور جو کچھ لکھتا ہے ۔ ایک معصوم طفل کی مانند لکھتا ہے ۔ نظامی ایک عالم ہے ۔ اور سوچ سوچ کر میدان کھلی میں قدم دھرتا ہے ۔ اس میں جہاں جہاں نہیں اور وہ انسانی فطرت کا بھی اچھی طرح مطالعہ نہیں کر سکتا ۔ مطالعہ کے وقت نظامی کا ایک صفحہ اور فردوسی کی طول طویل داستان برابر وقت لیتے ہیں ان باتیں سے جو نتیجہ نکلتا ہے ۔ کسی توہین و تشریح کا محتاج نہیں ۔ عرضی اس قسم کے تیر ہدف مقابلہ کے لئے چند سطریں کافی ہیں ۔ پیغمبر مجذبات

کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن وہ پرانی قسم کی تنقیر جس کی تان ہمیشہ مومن کے مقطع اور غالب کے مطلع یا ذوق کی زبان۔ غالب کی بندش اور مومن کی نازک خیالی پر اکر ٹوٹتی ہے۔ کبھی کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔

بھی قدیم طرز تنقید کی ایک دادرہ عنوانیوں کا تذکرہ باقی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلاف پر نکتہ چینی بیجا ہے۔ اور شاعری میں محبوب کی صفت کی تصریح نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ آخر امور واقعہ کے اعلان میں برائی کیا ہے۔ اگر قدیم شعرا شاہد پرست تھے۔ یا ان کی شاعری ناقص ہے۔ تو حضرت نقادوں حقیقتوں کے اظہار پر مجبور ہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ان کو اسلاف صالحین کے اخلاق یا ذات پر حملہ مقصود نہیں۔ وہ تو صرف اپنے خیال اور آرزو کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ تنقید کا مقصد تحقیق ہے۔ اس لئے کسی شخص کو تنقید کے انکشافات پر برہم نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح تحقیق و تدقیق کا دروازہ بند ہو جانے کا احتمال ہے۔ اور ہمارے خیال میں کوئی انسان چند نہیں کرتا کہ تنقید کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کر کے علم و ادب کی ترقی کو روک دیا جائے۔ اگر کوئی نقاد بے لاگ فیصلے صادر کر کے اردو ادب کی فضا کو زیادہ روشن اور واقعات کی لکھیوں کو خوش اسلوبی سے سلجھاتا ہے۔ تو ہمیں اس کا نہایت شکر گزار ہونا چاہیے۔ نہ کہ اس پر خواہ مخواہ زبان طعن و راز گریں۔

رہا محبوب کی صفت کا سوال تو ہمارے مقتدر رہنما اور شاعر اقبال نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یا رہو گا

سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ نازب آشکار ہو گا

یعنی اب ستر زبیراں۔ حدیث دیگران میں بیان نہیں ہو گا۔ نقادوں کی

بحث آرائی بے سود ہے۔ کیونکہ زمانہ خود فیصلہ کر رہا ہے۔ کہ آئندہ محبوب کی شخصیت ایشیائی شرم و حیا کی پردہ داریوں کا شکار نہیں رہے گی۔ یعنی نہ ہندی کی مانند عورت کے پردہ میں مرد اپنی آپ بیتی سنائیں گے۔ نہ فارسی کی مانند ترک شیراز کو خطاب کیا جائے گا۔ اور نہ رستم کے انداز میں اس کے بعض ملاحظین کی رائے مطابق شاعر عکرمات کو اپنا مخاطب بنائے گا۔ بلکہ ہر شاعر علانیہ ایک مرد عاشق کی حیثیت سے اپنی محبوبہ کو خطاب کرے گا۔

رباعی | رباعی کی بحر میں شگفتگی اور روانی لازمی ہے۔ قدما کی پابندیوں کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رباعی میں زبان اور بیان کی صفائی دیگر اصناف کلام کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔ اس صنف میں صرف بلند پایہ شعراء در قلم دکھا سکتے ہیں۔ رباعی کی عام متعلی بحر میں شعر کہنا مشکل ہے۔ مگر اچھے شاعروں کے لئے یہ بھی اتنی مشکل نہیں۔ رباعی میں شگفتگی پیدا کرنا آسان نہیں۔ اکثر شاعروں سے اس کی بندش درست نہیں بن آتی یہاں بھی اعلیٰ قوت ایجاد کی ضرورت ہے۔ جن شاعروں میں یہ قوت نہیں۔ وہ رباعی نہیں کہہ سکتے۔ یوں تو رباعی کے عمدہ ہونے کی اور بھی بہت سی خصوصیتیں ہیں لیکن ہمارے خیال میں ان سب سے زیادہ اہم جاذبیت ہے۔ جب تک رباعی کی زبان دلپذیر اور صاف نہ ہوگی۔ قاری اس سے نطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ رباعی میں حسن بیان جس قدر زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی افس کو پسند کیا جائے گا۔ اردو میں بہترین رباعیاں انیس کی ہیں۔ حالی کی بعض رباعیاں اچھی ہیں لیکن اس کی رباعیوں میں دی نقایص ہیں۔ جو اس کی دیگر اصناف سخن میں

پائی جاتی ہیں۔ عالمی کی طبیعت حسن اور لطافت سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ صاحب
تخیل نہیں۔ اس لئے وہ اپنی نظموں میں دلکشی نہیں پیدا کر سکتا۔

مثنوی | مثنوی کی یہ کھنے کے اصول جو صنایع کے مطابق بدلتے رہتے ہیں
اس مختصر مضمون میں ان پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں اس لئے
ہم ان کی توہین و تشریح کسی اور موقع پر اٹھا رکھتے ہیں۔ فی الحال یہی کہ دنیا
کافی ہے۔ کہ دیگر اصناف سخن کی طرح یہاں بھی ذوقِ سلیم ہمارا بہترین خطر طریق
ہے۔ اور ان آئین تنقید کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جن سے ہر نوع اور ہر قسم
کی شاعری پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔



دوسرا باب

سوانح حیات

بیسویں صدی ہندوستان کے لئے گوناگوں تخلیقات اور معاصبات کا ناپا نہ ہے۔ دارالسلطنت دہلی مغل فرارواؤں کی اتوانی کے سبب اندرونی و بیرونی حوادث کا شکار ہوا۔ اس لئے اس کے ساکنوں نے وطن مالوف کو چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ جو ان دنوں امن و مسرت اور عیش و عشرت کا گہوارہ تھا۔ تمام اہل کمال انشا جرات مصحفی اور سودا اپنے مولد و منشاء کو چھوڑ کر لکھنؤ کو روانہ ہو گئے۔ لیکن دہلی کی زمین مردم خیز ہے۔ اگرچہ تاریخ زمانہ سے اس کا سامنا۔ بسا یا باغ جڑ گیا۔ پھر بھی اس کی بہار رفتہ جلد ہی اس کے تاشا کے سنے واپس آئی۔ اس کی خاک سے ایک بار پھر ایسے پھول اُگے جن سے لکھنؤ کے عشرت نرا کی خوشبو میں مات ہو گئیں۔ یہ تو ممکن نہ تھا۔ کہ زمانہ دوسرا میر تقی میر۔ میر حسن یا میر درد پیدا کرے۔ لیکن ناسخ و آتش کی نظیر ناممکن نہ تھی۔ شاعر اردو ادب کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ یہ وہ سال ہے۔ جب دہلی نے اپنا کھویا ہوا ادبی اقتدار عاقل کیا۔ اور لکھنؤ کے مقابلہ میں شیخ محمد ابراہیم ذوق جیسا نامور شاعر پیدا کیا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ وہ فی الواقع ایک برگزیدہ شعر تھا۔ تاہم شہرت کے لحاظ سے وہ لکھنؤ کے کسی شاعر سے نتیجے نہیں۔ یہ دہلی کا نام روشن کرنے والا انسان ایک غریب سپاہی شیخ محمد مصفاں کے گھر پیدا ہوا۔

شیخ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لئے دونوں کو عزیز تھا۔ انہوں نے اُس کو جتنی آرام و آسائش ہو سکتی تھی پہنچائی۔ خارجی اثرات اس نوواردِ اقلیم ہستی کو شروع ہی سے اپنے سانچے میں ڈھالنے لگ گئے۔ ایک طرف خبیلی رجحانات اُس کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ تو دوسری طرف ماحول اختیار کو جہر میں بدلتا رہا۔

اس ہو نہ را۔ اخاذ طفل کی زندگی کی ابتدائی منتریں اتنی آرام سے نہ گذریں۔ وہ گونا گون عوارض کے خازن ہیں سے گذرا اور کئی بار اُس کی جان جو کھوں میں پڑی۔ آزاد نے لکھا ہے کہ چچک نے لٹی بار شدید حملے کئے مگر قدرت کو اس استاد زمانہ کے نقش ہستی کو مٹانا منظور نہ تھا۔ اس لئے یہ نہ ہال طوفانِ حوادث کے ہاتھوں پامال نہ ہوا۔ اور نشی و نما پر خاص وعام میں معروف ہوا۔

زندگی کے ابتدائی مرحلے طے کرے کے بعد ذوق کو ایک مکتب میں داخل کیا گیا۔ حافظ غلام رسول نام ایک بزرگ مدرسہ کے معلم تھے۔ جو اپنا دل خوش کرنے کے لئے یا اس لئے کہ شہر میں شاعری کا بہت چرچا تھا۔ خود بھی غزلیں کہتے تھے۔ اور اپنے شاگردوں میں بھی مذاقِ شعری پیدا کرتے تھے ایسے استاد کے شاگرد کیوں نہ شاعری میں دلچسپی لیتے۔ آفتاب کی روشنی میں

علیہک صاحبِ مثنوی احمد حسین نے خیالاتِ ذوق کے نام سے شیخ مرحوم کی ایک سوانحی تحریک ہے۔ کتاب معمولی ہے۔ لیکن کہیں کہیں نہایت معقول تراشیں ظاہر کی گئی ہیں۔ جو کچھ موقوف ہے تعصب ہے۔ اور ان نقادوں میں سے نہیں۔ جو دہرہ و دانستہ طرف داری سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے ذوق کی کتنی تعریف کرتے کرتے اُس کے قلم سے متنازعہ فیہ امور کے متعلق بالکل غیر جانبدارانہ اور صحیح فیصلے صادر ہو گئے ہیں جن کا متعصب نقادوں سے کبھی سراجام نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ ہمیں یہ کتاب اُس وقت ہاتھ آئی جب ہماری تصنیف کن بے مرطی سے نکل کر محاسن کی منزل میں قدم رکھنے والی تھی یہی وجہ ہے کہ ہم نے خیالاتِ ذوق سے جو کچھ ان کہا ہے۔ وہ اصل کتاب کی بجائے غنی نوٹوں میں مندرج ہے۔

علی صاحب کی چند کھری کھری باتیں واقعی سننے کے لائق نہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ آزاد نے اپنے

ناٹواں ڈرے بھی ہلک اٹھتے ہیں۔ شیخ نے اوایل عمر ہی میں طبیعت کی جولانیاں دکھانی شروع کیں۔ کہتے ہیں کہ آپ نے پہلا شعر حمد اور دہرا نعت میں لکھا۔ یہ ان کے میدان طبع کی ایک عمدہ نشانی ہے۔ آپ کی شاعری کا آغاز تفریف اور مدح و ثنا ہی سے ہوا۔ جو زندگی بھر ان کا مرغوب ترین مشغلہ رہا۔ ابتدا میں وہ حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ پھر شاہ نصیر کے فارغ سخن کی شان پر وازدیکھی تو ان کے سامنے ناز وئے شاگردی طے کیا۔ شاگرد کو اپنی پسند کا استاد مل گیا اور وہ اس کے طرز میں شعر کہنے لگا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے اتنی مشق بہم پہنچائی کہ استاد سے ہماری کا دعویٰ کرنے کے قابل ہو گئے۔ شاہ نصیر کی طرف سے طبیعت کشیدہ رہنے لگی۔ استاد نے بھی شاگرد کے طور پر بے طورہ دیکھ کر بدسلوکی اختیار کی۔ اس طرح دونوں کے درمیان ناراضگی کی فلیج عاقل ہو گئی۔ جو بعد میں شدید عداوت پر منتج ہوئی۔ ذوق نے اصلاح کے بغیر شعر کہنے شروع کیے۔ شاہ نصیر اس بات سے اور بھی رنجیدہ ہوئے۔ اور علانیہ مخالفت شروع کر دی۔ استاد اپنے شاگرد کے کہاں پر رشک کھانے لگا۔ ادھر شاگرد بھی ہوشیار تھا۔ اس نے مشاعروں میں شاہ نصیر کے مقابلہ میں شعر کہے۔ جب زیادہ مشق سخن بہم پہنچی۔ تو ذوق نے اساتذہ کا قبیح شروع کیا۔ میزبان فوج کی غزلیں پر غزلیں کہیں اور لیگوں سے داد دہانی۔ اس سے شاہ نصیر اور بھی برا فرد خستہ ہوئے۔ اور دل میں ایسی گرہ پڑی کہ مرتے دم

تک مٹھن خوبات ذوق نے شاگرد کی ایسی مناقشت کا الزام شاگرد پر عاید کیا ہے۔ اور اسے رشتہ میں وہ بڑی عمدہ حق بجانب ہے۔ غنی صاحب لکھتے ہیں کہ ”شیخ کی اپنے لڑکپن سے بھی لوگیاں جھوکیں مٹی تھیں۔ بلکہ سب باتیں بڑے شاعر تک عمدہ و عجیب عام طور پر ان کا سلوک لوگوں سے اچھا تھا۔ غالباً یہ رسمی تربیت ہے۔ کیونکہ ایک سوانح نویس بقیہ صفحہ ۵۳

تک نہ کھل سکی۔ آزاد نے لکھا ہے کہ استاد ذوق نے سودا کے قلع میں جو پہلی غزل لکھی۔ اس کا مطلع یہ ہے کہ

لکھتا ہر قدم ہے وہ یہ ہوش نقش پا
ہو خاک عاشقاں نہ ہم آغوش نقش پا

اس غزل نے شیخ کو تمام شہر میں مشہور کر دیا۔ میر کا ظم حسین نے جو مرزا ابو ظفر ولیعہد ملعنت کے ملازم خاص تھا۔ آپ کی دستگیری کی۔ اس زمانہ میں امر آؤ رو سا کا التفات۔ التفات شاہی سے کم نہ تھا۔ میر کا ظم حسین نے ذوق کو ایک جوہر قابل خیال کرتے ہوئے۔ ولیعہد کا مصاحب خاص بنا دیا۔ اسی برس کی عمر میں یہ کامیابی نہایت خوش قسمتی کی علامت ہے۔ شیخ نے ابو ظفر کے ساتھ رشٹہ محبت استوار کیا۔ اور ان کے ہاں چار روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ اس قلیل رقم کے متعلق آزاد نے درست کہا ہے کہ وہ لٹھ نہ تھے۔ بلکہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون تھے۔

اس کے بعد ذوق کو نواب الہی بخش خان معروف جیسادریا بخش مرہٹے یا بھو سخن پر دراور سخن فہم ہونے کے علاوہ شاعر نواز بھی تھے۔ نواب مرحوم مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خسر تھے۔ وہ ایک نہایت صاف باطن اور فقیرانہ وضع کے انسان تھے۔ سادگی اور درویشی کو پسند کرتے تھے۔ لیکن مذاق میں کچھ سخی فہم تھی۔ آزاد کی روایت کے مطابق ذوق نے خود تسلیم کیا ہے کہ

یہ بقیہ صفحہ ۵۵۔ کسی ادیب کے سوانح حیات سپرد قلم کرتے وقت قدرتی طور پر اس کا زیادہ تر تعلق نہیں کر سکتا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مثنوی صاحبان بطور کے بعد جلد ہی قریب ختم ہوتے ہیں۔ کہ شیخ کے استاد حافظ ظلم سوزی اثر سنانے لگے تو آپ اٹھ کر چلنے کو تیار ہوئے۔ حتیٰ کہ ادب اور سعادت مند ہی ہرگز اس کی منتہی نہ تھی۔ شاگرد کو لازم تھا۔ کہ وہ حتی المقدور اس کی تعریف کرتا معمولی لوگ بھی اس قسم کے سوء ادب کے مرتکب نہیں کیے ہاتھ ہے کہ شیخ مرحوم میں جو ان کی زور اور کمال کا جھوٹا تھا۔ اس لئے وہ اپنے استاد اور دوسرے لوگوں سے بدسلوکی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مثنوی صاحب نے یہاں ذوق کی بدکرداری کا جو عذر پیش کیا ہے وہ مرہٹا بھی مسخوع نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد جناب مولف شاہ فقیر اور ذوق کے ہر غزل و غنما کا سارا مابرایان فرماتے ہیں اور

آپ نے نواب مرحوم سے معنوی استفادہ کے علاوہ مادی استفادہ بھی کیا لیکن جس قسم کے واقعات، بحیات میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلق نے شاعر کی خودداری کا خون کر دیا۔ ذوق نے کہا ہے کہ اگرچہ ہمیں بہت سی کامشیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن ہم ان کی وجہ سے خود بن گئے۔ جہاں تک تصوف اخلاق اور درویشانہ عادات و خصائل کا تعلق ہے۔ نواب مرحوم نے شاید شیخ کی طبیعت پر اثر ڈالا ہو۔ مگر وقت بے وقت کی نوازشوں نے ان کو طامع اور حریص بنا دیا۔

جب ذوق کا مشاعروں میں شاہ فیض سے مقابل ہوا۔ تو ان کو مجبوراً اپنی علمیت بڑھانی پڑی۔ انہوں نے تحصیل علوم اور سیر کتب پر زور دیا۔ حافظہ تیز تھا۔ جہاں جہاں حکمت کے موتی ملے سمیٹ لئے۔ تمام مروجہ علوم و فنون میں دستگاہ تمام پیدا کر کے ادب اب ختم پر اپنا سکہ جمایا۔ برحق سیکھا اور موسیقی۔ طبابت۔ نجوم و رمل کی اصطلاحوں کو اپنے اشعار میں استعمال کیا۔ چنانچہ وہ قصیدہ تابیہ میں اپنے کلمات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں۔

کبھی ہمت تھی مری قاعدہ قمر میں عرف	کبھی تھی خون میں ہر خون مجھے محبت
کبھی منطق کو تفوق تھا امر کا طلق سے	تخت حکمت ہو یہ فن گرچہ ہر تخت حکمت
کبھی میں کرتا تھا تصریح صفائی و بیان	کبھی کرتا تھا میں تو فصیح نجوم و حیثیت
کبھی تقسیم فرایض کبھی تقسیم اصول	کبھی تعلیم عقاید یہ بکتا بے منت
کبھی تھا علم الہی کی طرف ذہن رسا	کبھی کرتی تھی طبیعت میں طبیعت وجود
کبھی منقول پہ مائل کبھی سوئے معقول	کبھی میں تھجہ پہ راغب کبھی ہوئے حکمت
کبھی میں کرتا تھا قانون تشریح علاج	کبھی میں کرتا تھا ناموس پہ بھیج نعمت
کبھی مشایخوں سے کرتا تھا میں پیشروی	کبھی لے جاتا تھا اشرف خیلوں پر میں سبقت

جون ہندس کبھی مالوف بشکل و مقدار جوں محاسب کبھی مصروف بہ ضرب قنمت
کبھی افسون و عزیمت کبھی تعویذ و طلسم کبھی تجویز کوۃ اور کبھی قصد دعوت
مابین موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا کبھی میں ہمارہ مقام اور کبھی چاروں

کبھی میں لغز و معما میں نہایت ذی ہوش

کبھی اخبار تواریخ میں صاحب خیرت

شیخ نہایت سے دلہنی پیدا کی۔ اور چھپتیس برس کی عمر میں تائب ہو کر کہا۔ اے
ذوق بگوسہ ہار تو بہ قصیدہ شاعروں کا کاسہ گدائی ہے۔ چونکہ قدیم شعرا کا شعر گوئی
کے سوا اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ اس لئے ذوق نے اس میں ہمارت نامہ
بہم پہنچائی۔ ہر جشن اور ہر تقریب پر قصیدے کہے۔ اور خاقانی ہند کا خطاب
پایا۔ پھر جب ابر شاہ فوت ہوا اور مرزا ابو ظفر شخت نشین ہوا۔ تو وہ مستقل طور
پر درباری شاعر بن گئے۔ ایک دفعہ بادشاہ نے دیر تک طویل رہنے کے بعد
شفایابی۔ تو ایک قصیدہ غمرا کے صلہ میں ان کو خان بہادر کا خطاب
اور ایک ماٹھی عطا ہوا۔ کچھ دیر بعد ایک گاؤں بھی جاگیر میں پایا۔ بادشاہ کی
اس داد و ہش کے باوجود بیخ بست رہوں گے گلہ مندر ہے۔ اس لئے لکھا ہے کہ

یوں پھر میں اہل کمال آشفتمہ حال افسوس ہے

اے کمال افسوس ہے مجھ پر کمال افسوس ہے

غالباً اسی وجہ سے وہ مرزا مغل بیگ وزیر سلطنت پر بھی حسد کرتے
تھے۔ جب معزول ہو گیا۔ تو ذوق نے اس کو ایک تازیانہ بہرہ خیال کیا
اور اپنی طبیعت کو قناعت کی طرف بائیل کرنے کی کوشش کی۔ رتبہ و جاہ
کی بجائے اپنے کمالات پر ناز کرنے لگے۔ اور اپنے پست و قامت ہونے
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ

اومیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
بہت اہمیت یہ نہ ہوئے بہت قلمت ہو تو ہو

ذوق کی طبیعت حیوانات کی ایذا دہی سے بہت وحشت کرتی تھی۔
یہاں تک کہ وہ سانپ کو مارنے سے بھی گریز فرماتے تھے۔ آبجیات میں لکھا
ہے کہ ایک نسخہ کے لئے چالیس چڑیوں کا مغز درکار تھا۔ ذوق نے ان کو پکڑ
ایک یخچرے میں بند کیا۔ ان کو پھر کتے دیکھ کر آپ نے نسخہ کا خیال چھوڑ کر
چڑیوں کو رہا کر دیا۔ آزادانہ ان کے متعلق بعض روایتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان
سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت میں انفعالیات بہت تھیں۔ ایک بے تعصب
نقاد اس کو عداوتِ دال سے متجاوز قرار دے گا۔ آپ ہی کی روایت
سے کہ شیخ کی دعا کا انداز بھی بہت عجیب تھا۔ دنیا بھر کی صحتِ سلامت کی دعا
مانگتے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ہمسایوں کے بیمار بیلوں کے لئے بھی دعائے خیر
فرماتے۔

شیخ کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اس لئے ساری عمر دہلی میں گزاری۔
اشادید دوسرے شاعروں کو پریشان حال دیکھ کر جہاں آباد سے باہر نہیں جانا
پاہتے تھے۔

آزادانے لکھا ہے کہ آپ کی شعر کہنے کی جگہ اس قدر موزوں نہ تھی۔ وہ ایک
نگ و تار کو پھڑکی میں شعر کہتے تھے شاید اسی وجہ سے اس کی لطافت رائیں ہو
جی۔ بعض اوقات حاجتی میں جھٹ کر شعر بناتے۔ یعنی غالب کی مانند آپ کے نزدیک
کوئی کیسے کیا بھی فضا ضروری نہ تھی۔

غالب فرماتے ہیں کہ

ہر نہ سننے کو بہ آہنگ غزل بنائیں
ناگ تم بوسے و بواہنگ فغانی باریں

ذوق کو فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ بہت عقیدت تھی۔ وہ اساتذہ کو
دب سے یاد فرماتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر کا متبع بھی کرتے تھے۔ آپ نے
سے مذہب کی تصریح نہیں کی۔ چونکہ بادشاہ حنفی تھا۔ اور وہ شیعہ مراعات
پنے اپنے تشیع کا کھل کر اظہار نہ کیا۔

شیخ کو اپنے زمانہ میں نہایت شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کے کلام کو تبرک
سمجھا جاتا تھا۔ اور خاص و عام اس کی قدر دانی کرتے تھے۔ آپ کے مقابلہ
میں کسی اور شاعر کا رنگ نہ جم سکا۔ بادشاہ اور امرا سے لے کر عوام تک آپ
کی شاعری کے مداح تھے۔ جو نہی کوئی غزل کہتے۔ تمام شہر میں مشہور ہو جاتی۔
شاعروں میں غزل پڑھتے تو داد و تحسین کی صداؤں سے فضا گونج اُٹھتی۔
مولانا محمد حسین آزاد مرحوم واقعی آزاد تھے۔ وہ ہر بات کو لطیف بنا کر دنیا میں
مشہور کرنے کے عادی تھے۔ ورنہ حاجتی۔ انگنائی۔ ٹھمری کوتال پر بٹھانے اور
دیہاتی اور شہری کتوں والے قصے اس قابل نہ تھے۔ کہ صلیب تحریر میں لائے
جائیں۔ آزاد کی طبیعت میں طفلیت بہت تھی۔ آپ نے اپنی طرف سے
ذوق کا ایک قصیدہ غرا لکھا۔ لیکن وہ ایک ہجو بیچ بن کر رہ گیا۔ بعض اوقات
ایسا بھی ہوتا ہے۔ عیوب برہنگی کے داغ کو چھپانے کی کوشش ان کو اور
بھی عریاں کر دیتی ہے۔

شیخ نے سب سے اعلیٰ میں وفات پائی۔ آزاد نے آپ کا تمام کلام جمع کیا۔
اور دیباچہ میں لکھا کہ غزلیات کی تعداد دراصل بہت زیادہ تھی۔ غدر کے
ہنگامہ میں شیخ کے دیوان بے شیرازہ کے بہت سے اور انی ضائع ہو گئے۔
شاید یہ درست ہو۔ لیکن ظفر کے کلام کو ذوق ہی کا رشہ عیض قرار دینا ایک
ہمتان عظیم ہے۔ ان کی تصنیف میں شیخ کا قطعاً کوئی ہاتھ نہیں

ہے۔ دے ترے من چلے کا سودا۔ آدھا کھٹا آدھا بیٹھا۔ اور کچھ راہ خدا
دے جا۔ جائز بھلا ہوگا! معمولی تضمینیں ہیں •

۱۵ مولف حیاتِ ذوق، اس معاملہ کے متعلق عقلی رائے قائم کرتا ہے۔ اور اس مسئلہ
سے کام نہیں لیتا۔ اُس کا دعویٰ مولانا محمد حسین آزاد کے بے اعتبار ہونے پر مبنی
ہے۔ بہر حال آپ کی رائے سے کہ ”جو چار دلیہ ان ظفر کے راج ہیں۔ وہ مرزا
ابو ظفر کے اپنے کہے ہوئے ہیں۔ اُن کو ذوق کی تصنیف قرار دینا۔ اُن کے ہونا خوب
کا طبعِ آزاد چٹکلا ہے۔“

تیسرا باب

ماحول اور اُس کے اثرات

۱۔ ایرانی شاعری

اس زمانے میں دہلی کے کوچہ و بازار میں ہندی سلاح پوشوں کا گزر ہے اور قدیم جنگی دلوں کو گنگا گاتے ہیں۔ لیکن رسومِ مردہ۔ پست میلانات اور حکومت کی کمزوری اذندہ دلوں کو بھی پڑمردہ خاطر بنا رہے ہیں۔ ان حالات میں رزمیہ شاعری فروغ نہیں پاسکتی۔ اور رزمیہ شاعری تو کیا بلند پایہ ناسفیانہ شاعری بھی نمودار نہیں ہو سکتی۔ لوگ قلعہ کی چار دیواری میں محصور ہو کر صنعتِ نظر سے اس قدر بیگانہ ہو گئے ہیں کہ وہ عالمگیر مسائل پر غور و خوض نہیں کر سکتے۔ سہ دے کر عشقیہ جذبات رہ گئے ہیں۔ جو تمام شاعروں کا مشترک سرمایہ سخن ہیں۔ غزل ان عاشقانہ جذبات کی مدت سے ترجمانی کر رہی ہے۔ اس لئے اس زمانے کی مرغوب ترین صنف سخن یہی ہے۔ اس کے ساتھ قصیدہ کو بھی قبول عام حاصل ہے۔ کیونکہ کبھی بادشاہوں کا تقرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ان حالات میں ماحول کا جو کچھ اثر ہو گا۔ غزل اور قصیدہ پر ہو گا۔ دیگر اصنافِ سخن اس سے بڑی حد تک غیر متاثر رہیں گی مارد و شاعری

کی تاریخ زیادہ تر غزل اور قصیدہ ہی کی تاریخ ہے۔ لیکن افسوس اردو شاعری کا ظہور ہوا تو اس وقت جبوقت فارسی شاعری خود رُو بہ منزل تھی۔ متاخرین شعرائے فارسی خود قعر مذلت میں غرق تھے۔ ان کا اثر اردو شاعری پر خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ ہندی شاعر۔ غنائی اور اس کے تبعین عربی۔ نظیری۔ اور فیضی کے طرز سے نامانوس ہیں۔ مگر اس سلسلہ کے خیال بند شاعروں کی مضمون آفرینی اور پیچیدہ بیانی بہت مقبول ثابت ہوئی ہے۔ اس طرز کے مشہور شاعر مرزا جلال اسیر شوکت بخاری اور زلالی خوانساری ہیں۔ یہ سب خیالی مضمونوں کو بیچ دے کر بیان کرنے کو شاعری کا کمال خیال کرتے ہیں۔ دور از نگاہ استعار۔ پیچیدہ ترکیبیں۔ ابہام۔ نازک خیالی اور اس قسم کی دیگر خصوصیتیں ان کی شاعری میں شدت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ مخلوط ابہام اور تعقید کے سلع یہ شعرا دیکھئے۔

دیر خواندی سوئے خویش دزد و دہمیدم۔ درین
پیش ازیں پام ز گرد راہ پیچیدن داشت

اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محبوب تیرے مجھے اپنے پاس دیر سے
بلا بھیجا۔ اور مجھے تیرا عندیہ فوراً معلوم ہو گیا۔ افسوس ہماری عشق میں
بتلا رہ کر میں اس قدر نحیف و نزار ہو گیا ہوں۔ کہ اگر تیری طرف آنے کا
ارادہ کروں تو گرد راہ جیسی کمزور چیز بھی میرے راستہ میں عایل ہوتی ہے
اور باؤں کو آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ مثنوی گلزار نسیم اسی قسم کے ادق
شعروں سے بھری پڑی ہے۔ تقریباً ہر شعر میں مضمون کو موڑ توڑ کر پیچیدگی
پیدا کی گئی ہے۔

دور از نگاہ استعاروں کی بھرمار اس طرز کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اور

تخیل تو اس طرز چراغ کا وہ روشن ہے۔ جس کے بغیر یہ روشن ہی نہیں ہو سکتا
یہ اشعارِ طالعہ ہوں۔ ۵

گرش بہ دیدن من گر یہ رُنداد چہ غم
ہناد آتش شوق من اردھاں غالی ست
من و نظارہ روئے کہ وقت جلوہ از تابش
ہے بر خورشق لرزد پس آئینہ سیمابش
کدام آئینہ باروئے او مقبل شد
کہ بقسرا ی جو ہر بندہ ز نقش ما

پہلے شعر کے معنی یہ ہیں کہ اگر محبوب مجھ کو دیکھ کر نہ روبا تو اس میں
کوئی تعجب کی بات نہیں چو کہ میری محبت کی آگ دھنوش سے غالی
ہے۔ اس لئے معشوق میرے پاس آتا ہے۔ تو اس کی آنکھوں کو دھنوا
نہیں لگتا۔ اور آنسو نہیں نکلتے۔

دوسرے شعر کا مطلب ہے کہ معشوق کی سطوتِ جمال کا یہ عالم
ہے کہ جب وہ آئینہ کو دیکھتا ہے۔ تو آئینہ کی پشت پر جو سیماب لگا ہے۔
وہ بھی خوف سے کانپنے لگ جاتا ہے۔

تیسرا شعر تخیلِ محض ہے۔ یعنی محبوب کو دیکھ کر جو ہر بھڑا رہتا ہے
اور اس کی طیش سے آئینہ کا رنگ بھی دور ہو جاتا ہے۔

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ خیال بند شاعر اس قسم کے مضامین قلمبند
کرتے ہیں۔ جن کی معذویت بہت خفیف ہوتی ہے۔ ان کے خیالات
کے طلسمِ الف بیلہ کے افسانوں سے کسی طرح کم نہیں۔

ناصر علی سرہندی۔ نور العین واقف۔ غنیمت اور بیدل اس شمع کے

ہندی پروانے ہیں۔ ان میں بید کی سب سے زیادہ صاحبِ تخیل ہے۔ لیکن مرزا غالب۔ جیسے مشکل پسند شاعر کے بغیر ان کا مطالعہ کون کر سکتے ہیں؟ تخیل اور معنی کی خوبیوں کا قبیح مشکل ہے۔ موشگافی۔ نکتہ پردازی اور صنایع و ہدایع الکتاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ عام شاعروں کے لئے ایک آسان مشق سمجھا کرتے ہیں۔

بید کی اور غنیمت وغیرہ کا ذکر پیش از وقت آگیا۔ درنہ ان کا زمانہ فروغ متاخرین شعرائے فارسی سے ملا ہوا ہے۔ ان سے پہلے بھی دو مقبول عام طرز رائج ہوئے۔ مرزا محمد علی صاحب نے غزل گوئی کا ایک نیا طرز ایجاد کیا۔ جس کو تمثیلیہ شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ صاحب دیگر قدیم شعرا کے برعکس رملہ کی اور قدرت کے عام واقعات اور سطحی مناظر کا مشاہدہ و مطالعہ کرتا ہے۔ اس کی نظر اشیا کے خواص اور مشابہت خوب محسوس کرتی ہے۔ یہی خصوصیت ہے۔ جس نے اس کو اچھوٹی مثالیں نظم کرنے کے قابل بنادیا۔ وہ ایک مصرع میں دعویٰ کرتا ہے۔ اور دوسرے مصرع میں اُس کی تائید کے لئے ایک شاعرانہ دلیل پیش کرتا ہے۔ مثالیہ شاعری کو بلند پایہ بنانے کے لئے پرشکوہ تخیل اور سلکھ ہوئے مذاق کی ضرورت ہے۔ اس کی عمرگی کا انحصار اسلوب بیان اور معنوی نزاکت پر ہے۔ انداز بیان میں ذرا بھی فرق آجائے۔ تو شعر کی لطافت اُن جمیل ابر پاروں کی طرح فنا ہو جاتی ہے جن کو ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا پریشان کر دیتا ہے۔

دوسرا طرز معاملہ ہندی یا وقوع گوئی ہے۔ عاشق کو عشق و محبت میں جو واقعات پیش آئیں یا اُس کے دل میں جو احساسات پیدا ہوں

۱۔ مثلاً۔ نیست دلیگری ز دہنہ تلمہا۔ آتش نرد و گھڑا راست ابراہیم را۔
فانوس صحابا مستہ چراغ تکیہ را۔ دامن کساں رز و ہما سفہ را۔

ان کو غزل یا مثنوی میں بیان کرنا معاملہ بندی کہلاتا ہے۔ اس طرز کو شرقِ قزغینی نے ایجاد کیا۔ اور میکی۔ ولی اور وحشی بزرگی نے ترقی دی۔ ان شاعروں کی طبیعت کا میلان ادنیٰ عشقِ عاشقی کی طرف تھا۔ ان کی کہانیاں حقیقی ہونے میں کلام نہیں۔ مگر چونکہ یہ تمام تر داخل و اسفل ہیں۔ اس لئے اربابِ ذوق ان کو پسند نہیں کرتے۔ وہ اس قسم کی وقوع گوئی کو ایک متبذل چیز خیال کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اس طرز کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے چونکہ طبائع کا میلان سفلیہ جذبات کی طرف ہے۔ اس لئے ہر شاعر اس میدانِ جولانی طبع دکھانا چاہتا ہے اس طرزِ تغزل کے ساتھ ایک نئی صنفِ بیان یعنی داستانِ ہندوستان میں داخل ہوئی ہے۔ اس کو بھی شعرِ بہت پسند کرتے ہیں۔ عاشقانہ چیز ہے جس میں محبوب کی صفات ظنیہ نہیں گھس گھس کا عطف بھی ہے۔ اس لئے شعر اس کو پسند کی نظر سے دیکھتے ہیں ایرانی قصیدہ نویسوں کے رشحات اس عہد کے درسیات میں داخل ہیں۔ انورسی۔ خاقانی اور عرفی کا کلام سب کی مزاوت میں رہا ہے۔ انوری ایک مشہور شاعر ہے۔ مگر اس کے کلام میں کوئی خاص شاعرانہ خوبی نہیں۔ قریباً کو اشکال اور مبالغہ اس قدر پسند تھا۔ کہ جہاں ان چیزوں کو دیکھتے فریفتہ ہو جاتے۔۔۔ یہی بات ہے۔ جس نے انورسی کو مشہور کیا۔ پھر بھی انتہا ضرور ہے۔ کہ انورسی نے اپنے قصیدوں میں کچھ کچھ آپ بیتی کا رنگ پیدا کیا۔ اور اس کی عبارت اس قدر دقیق نہیں۔ کہ اس کا سطرانہ دشوار ہو جائے +

خاقانی اس قدر مشکل اور مبالغہ آمیز شعر کہتا ہے کہ اس کے ایک قصیدہ کو غبور کرنے کے لئے بھی مہینوں کی محنت درکار ہے۔ مضامین

ہاں اور عبارت اُس تعریف کی مستحق ہے۔ جو ابو الفضل نے اُس کی
شان میں سپردِ قلم کی ہے *
عربی کا کلام نسبتاً آسان اور لطیف ہے۔ مگر اشکال اُس کی شاعری
پر بھی مسلط ہے *

۲۔ ہندوستانی شعر کا کلام

ہندی شاعر ایرانی شاعروں سے کچھ کم نہیں۔ وہ کہتے ہیں اور خوب
کہتے ہیں۔ دلی۔ مضمون۔ یک رنگ۔ سوز۔ درد۔ اور میر تو اگلے وقتوں کے
لوگ ہیں۔ ان کے سادہ طرز اس زمانہ کی طبیعت کے موافق نہیں۔ ہمارے
کہیں درد اور میر کی سلاست، تصوف، روحانیت، رقت اور مناسبات
پیدا ہو جائے۔ تو اس کو پسند کیا جاتا ہے۔ ان شاعروں کا سب سے
بڑا عطیہ وہ روزمرہ زبان ہے جس میں محاورات اور ضرب المثلیں کثرت
کے ساتھ بانی جاتی ہیں۔ یہ زبان بہت پسند کی گئی ہے۔ اور شعرا اس کو نہایت
شوق سے استعمال کرتے ہیں *

سودا۔ انشا اور جرأت یکہ تازان میدان سخن ہیں۔ انشا کی افش۔
جرأت کی جرأت اور سودا کا سودا۔ دیکھنے کے قابل ہیں۔ سو داخیل کہنے
ہیں کہ اب بھی مغلیں کا زور ہے۔ اور شعر کی جگہ میدان جنگ میں تلوار چل
رہی ہے۔ میر تقی میر کو اپنے بہتر نشتر و پر ناز ہے۔ مرزا رفیع اپنے بہتر
خنجر و پر ناز کرتے ہیں۔ ان نامور شاعروں کی طبیعت کا میدان داخلی
شاعری کی طرف نہیں۔ وہ شاعری کی خارجی خصوصیتوں کے پرستار
ہیں۔ ان کے دور کی روح خارجی شاعری کی متقاضی ہے۔ غزل کی
داخلیت شعرا کی طبیعت کے موافق نہیں۔ اس لئے وہ اب خیالی

مضمونوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ جن کی بنیاد تمام تر ظاہری خصوصیتوں پر ہے۔ مصنف جو شہرت، تصنیع، رکاکت، بھونڈے الفاظ، دکھاوے کا جوش، رکیک محاورات، پامال مضامین اور ناہموار زمینیں کثرت کے ساتھ باصورتاً خوب ہو، پھر بھی کوئی کام کی بات کہہ جاتا ہے۔ مگر انشا کی شاعری ظاہری صنعتگری اور شور و غوغا کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ ان دونوں شاعروں کے قصیدے بہت زوردار خیال کئے جاتے ہیں۔ اور ان کا تسبیح کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت میں پر تصنیع اور اور بے وقعت ہیں۔ بعض نقاد کہتے ہیں۔ کہ اصول فن کے لحاظ سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ زمینوں کی سنگلاخی، اشکال، جوش، تخیل کا لطف، مضامین کا تنوع، محاورہ بازی کیا ہے۔ جو ان کے یہاں موجود نہیں؟ یہ قصاید ایران کے مسلم الثبوت اور قادر الکلام شعرا کا مدلل اور مسکت جواب ہیں۔ اور حقیقتاً معیاری قصاید ہیں۔ ہمیں ان آراء سے اختلاف ہے۔ معنوی خوبیوں کی کمی کی وجہ سے ان کی بلندی کی تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ بہر حال ہمارے شاعران قصاید کے پرستار ہیں۔ اور ان کی سر خصوصیت کو قابل تقلید خیال کرتے ہیں +

دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ میں شعرو سخن کا چرچا ہوا۔ یہاں کے ادبی توجہات کی لہر دہلی تک پہنچیں۔ اور وہاں کی زمین کو بھی سیراب کیا۔ مرثیہ صرف لکھنؤ کی فضا ہی میں نشوونما پا سکتا ہے۔ جہاں آباد کی فضا اس کی پرورش کے قابل نہیں۔ ناسخ اور آتش نے شعر لکھنؤ کی ادبی جانشین ہیں۔ سودا، انشا اور جرأت کی شاعری نے ان کے نغزل میں بنا جنم لیا ہے۔ وہی بھڑک، وہی قفاطی، صنعت پرستی، دشوار گزار زمینیں، ٹھیکو زبان اور خیال آفرینی یہاں بھی سکھایا۔ بن گئی ہے۔ ناسخ غیر مخلوط

خارجی شاعری کا علمبردار ہے۔ وہ ایک خاص لکھنوی چیز پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اُس کو دہلی کی معنی فوازی اور روحانیت کی آمیزش مطلوب نہیں۔ اُس نے تخیل کو اپنا موضوع بنالیا ہے۔ اور اس طرز کو اس قدر رواج دیا ہے۔ کہ زلالی۔ ناصر علی سرہندی۔ جلال اسیر وغیرہ کی سب خیال آرائیاں گلدستہ طاق نسیاں بن گئی ہیں۔ طمطراق۔ سج دھج۔ محاورہ بندی۔ بلند بانگ الفاظ۔ موشگافی۔ نکتہ پردازی۔ اور پیچیدار زمینیں ناسخ پر ختم ہیں۔ پیش پا افتادہ مضامین۔ بے روح جذبات۔ رسمیت۔ غیر عادی تخیل اور کوہ کنڈن گاہ برادرانِ ان خصوصیتوں میں کوئی شاعر ناسخ کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اُس کا یہ طرز دلی میں مقبول ہوا ہے۔ سب لوگ ناسخ کو ایک شے طرز کا موجد اور قدیم طرزوں کا ناسخ تسلیم کرتے ہیں۔ ہر زبان پر اُس کا نام ہے اور ہر محفل میں اُس کے طرز کے چرچے ہیں۔ میر کی طرح وہ بھی دعویٰ کر سکتا ہے۔ کہ

مرے قلم نے ہے ملک سخن تمام لیا
لکھنؤ اور دلی میں ہزاروں لوگ ناسخ کا دم بھرتے ہیں۔ اور تمام شاعروں کو چھوڑ کر اُس کا تتبع کرتے ہیں۔ اس کی تقلید شاعری کے لئے بہت مضر ثابت ہو گئی۔

لکھنؤ کی عام شاعری بھی دلی پر اثر انداز ہوئی ہے۔ یہاں سے نئے نئے طرز نکل کر جہاں آباد کو جاتے ہیں۔ دہلی کے اپنے آتش کدے خاموش ہیں۔ اور پورب کی ہوائیں دلوں کو گرماتی ہیں۔ جو طرز یہاں سے نکلتا ہے اہل دہلی اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ اور تمام شہر میں پھیلا دیتے ہیں۔ طوفانی غزلیں۔ دو غزلے سے غزلے۔ نازک خیالی۔ مضمون بندی۔ اور

مستطیع و بدائع نگہنوی کی خاص چیزیں ہیں۔ اور دہلی کے شاعران کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں +

اہل دہلی خود داخلی شاعری سے بیزار ہیں۔ ظاہراً میر تقی میر کے معتقد اور کلمہ کہ ہیں۔ لیکن طبیعت کچھ اور چاہتی ہے۔ اب ان کو خارجی شاعری کیساتھ لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ جذباتی شاعری بے کیف معلوم ہوتی ہے۔ محاورہ سندی۔ لفظی تلازمات۔ اور خیالی مضمون یہاں بھی شاعری کے جزو کل کے مالک بن گئے ہیں +

اس زمانہ میں ادنیٰ و اعلیٰ طبقے کچھ اس قدر گھل مل گئے ہیں۔ کہ ان کی عام زندگی ایک جیسی ہو گئی ہے۔ سب کی دلچسپیاں۔ مشاغل اور طبیعتیں ایک ہی قسم کی ہیں۔ اس لئے خواہ ظفر ہو۔ خواہ مومن۔ نواب الہی بخش ہو یا ذوقی تمام تعلقہ کی عام روزمرہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اور عام جذبات و واقعات کو ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ ان کا مذاق بھی ایک ہی قسم کا ہے۔ غالب جیسا لغات پسند اور نووارد شاعر اس ہمہ گیر اثر سے بیگانہ رہے تو خیر۔ ورنہ باقی سب لوگ گھریلو زبان۔ ہلکے پھلکے مضامین اور نازک خیالیوں کے دلدراہ ہیں۔ مرزا اپنے ہی طرز کو رواج دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی نارسیت۔ طویلانی ترکیبیں۔ استعارے اور فلسفیانہ خیالات لوگوں کو پسند نہیں۔ بعض شاعران کا تتبع کرتے ہیں۔ مگر آپ نے درست فرمایا ہے کہ سن

مدعی خواست رود بر اثر من غالب

آنچه خود داشت به سوداے چو من بعدن رفت

شاہد ہی یہ ہے کہ کوئی شاعران کے طرز میں کامیاب اُترے۔ ترکیب اور

فارسیّت کی محوڑی بہت نمایش پیدا کر لی جائے تو قبل تعجب نہیں
شاہ نصیر نے لکھنؤ سے 'عسل کی مکھی'۔ 'جبل کی مکھی'۔ اور اسی قسم کی اور ناہموار
زمینیں لائیں۔ یہ بھی دہلی پر چھا جانے والی چیزیں ہیں۔ یہاں کے تمام شاعر اپنی
قادر الکلامی کائنات بہم پہنچانے کیلئے ضرور اس قسم کی غزلیں کہیں گے۔ مگر اس
کا اثر ان کی شاعری کے لئے اچھا ثابت نہ ہو گا۔

۳۔ ادبی روایات

اُردو اور فارسی کی ادبی روایات کا سلسلہ بارہویں صدی عیسوی
سے شروع ہوا۔ جب فردوسی۔ عنصری۔ منوچہری۔ فرخی۔ انوری وغیرہ آزاد
شعرا کا تخلیقی دور ختم ہوا تو قدرتی طور پر ایک اعتدالی دور کا آغاز ہوا۔ ارباب علم
نے عقل و ہوش کی آنکھ سے شاعری کا مطالعہ شروع کیا۔ اور شعر گوئی کے
قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ ان ادبی قانون سازوں میں سب سے زیادہ مشہور
رشید الدین دہلوی ہے۔ جس کی تصنیف 'مدائن السحر البلاغت' کی نسبت کہا جا
سکتا ہے کہ جہاں تک قدیم شاعری کا تعلق ہے وہ
گر نقد و نظر بہ دہر آئیں بودے
اُس دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اس صحیفہ تنقید میں بعد کے نقادوں نے اور بھی ضامیاں برتیں اور
تعلقات کا ایک دفتر رد و ن کیا۔ قدیم شاعری کی پیش پا افتادہ زبان کو
اسی زمانہ سے فروغ حاصل ہوا۔ اس زبان کی مختصر کیفیت یوں بیان کی
جا سکتی ہے کہ یہ شاعری کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے۔ جو عام زبان کے
لئے محاورات۔ کہاوتیں اور ضرب المثلیں۔ جس طرح محاورات معین
ماین کے لئے ناگوار مجازات ہیں۔ اسی طرح نرگس۔ شمع۔ جنون چہرہ و

ساقی۔ نخبانہ۔ وحشت گردی۔ زلف گرہ گیر۔ چین۔ نیاز۔ محل۔ صحرا۔ بسل
چاکر۔ گرہاں۔ محشر۔ ستم۔ قاتل۔ ہٹ۔ چرخ۔ صنم۔ بادیہ۔ پیانی۔ وغیرہ شاعری
کے وہ پامال الفاظ ہیں۔ جن کو بلا سوچے سمجھے استعمال کر دیا جاتا ہے۔ رسمیت
اور تعین کسی بات میں ہوں۔ معیوب ہیں۔ جس طرح تھیں۔ دروں کی معنی۔ زبان
اور دھنیں کو بہتہ سنگا۔ حساس۔ کیا کرتی ہیں۔ سبط۔ یہ الفاظ بھی ناگوار گزرتے ہیں۔

قدیمانہ زبان کے ساتھ پامال مضامین بھی نظر گاہ جیا ہیں۔ یاس۔ بیماری۔ غم
شب۔ بھراں کی طوالت۔ گریہ و فغاں۔ شراب نوشی۔ اور وحشت گردی۔ معنوی
کٹا فتوں کا ایک پریشان کن ہجوم ہیں۔ ان کی موجودگی نے شاعری کو بازیچہ الفاظ
بنادیا ہے۔ زبان بھی موجود ہے۔ اور مضامین بھی ہتیا ہیں۔ اس لئے الفاظ کے
الٹ پھیر اور مضامین کے رد و بدل سے شعرتیار کئے جاسکتے ہیں۔ چونکہ غزل
کے قانئے اور نویسیں محدود وسعت کی حامل ہیں۔ اس لئے اگر مضامین قلیل
بھی ہوں۔ پھر بھی غزل میں مختلف طریقوں سے لائے جاسکتے ہیں۔ ہمارے
شاعر غزل کی ہیئت کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انہوں نے پیش پا افتادہ
مضامین کو اس قدر باندھا ہے۔ کہ وہ سنگ سبرہ سے بھی زیادہ خفیف و سبک
بن گئے ہیں۔

عروض بھی اسی قسم کی آہنی زنجیروں میں اسیر ہے۔ شاعرانہ زبان اور
مضامین کی مانند جو متعین میرد شاعران کے مقررہ حدود سے باہر نہیں جا
سکتے۔ ہر مضمون اور ہر موضوع کے لئے ایک خاص بحر اور پیرایہ کا سلسلہ پاپیل
سے مقرر ہے۔ اگر کوئی شاعر اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو وہ نکتہ چین نگاہوں
کا ہدف بن جاتا ہے۔

تشبیہات۔ استعارات۔ صنایع و بدایع۔ بندش۔ قافیہ۔ ردیف

اصنافِ سخن کی ساخت - یعنی ہر بات میں رسوم و قیود کا یہی عام ہے۔ محبوب کے ابرو کو ہلال اور کمان - بینی کو زنبق لبوں کو پستہ - دہن کو تنگ فکر - اور آنکھ کو بادام کے علاوہ اور کسی چیز سے تشبیہ دینا معلوم کو چھوڑ کر مہوم کی تلاش میں سرگرداں ہونا ہے۔ غالب خاصہ جدت طراز شاعر ہے۔ لیکن وہ بھی یکنی ڈلی پر نظم لکھتے وقت خالی ہستان پر یزد - مسیٰ آلودہ سر انگشت جینا ہر نماز - ہر مکتوب عزیزانِ گرامی اور نقشِ پئے ناقہ سلی سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

اصولِ فن میں بھی یہی سخت گیر اور سخت جاں رسمیت کار فرما ہے قافیہ کی تکرار - اصناف کا تعدد حسنِ مطلع - تنافر - اور ذمہ دہ پایندہ قانون ہیں۔ جن سے اشعار کی خوبیوں اور برائیوں کا امتحان کیا جاتا ہے۔

قدیم اور موجودہ شاعروں کے بعض مشاغل بھی ادبی روایات میں شامل ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں شاگردی اور استادی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب تعلق ہے۔ جھلا ایک حقیقی شاعر کو استاد کی ضرورت ہی کیا ہے اس زمانے میں شخصیت کا اظہار ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے ہر شاعر کسی تجربہ کار صاحبِ سخن کا شاگرد بنتا ہے۔ اور اس کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ وہ ہر بات میں استاد کا دست نگر رہتا ہے۔ تقلیدِ جدت کی دشمن ہے۔ اس لئے یہ لوگ استاد کے متبع میں اپنی شخصیت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فرسودگی کو زیادہ فرسودہ اور شاعری کو زیادہ منتشر بنا دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے کام کی اصلاح ہو یا نہ ہو۔ شاعری ضرور زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

اساتذہ کی غزل پر غزل کہنا بھی ایک رسم بن چکی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شاعروں کے دل میں کوئی اندرونی تحریک نہیں ہوتی۔ وہ

احساس کے بغیر اساتذہ سے بڑھنے کے لئے غزل کہتا ہے۔ یا محض سلف پرستی کا دلدادہ ہے۔ جو انسان کی تخلیقی قوتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ ہر صورت اساتذہ کی غزل پر غزل کہنا شاعری کو پُر تصنع بنا دیتا ہے +

اساتذہ سے بڑھنے کی خواہش جب زیادہ زور پکڑتی ہے۔ تو معاصر شعرا سے رقابت اور منافقت آزمائی کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ علانیہ مشاعرے ہوتے ہیں۔ حسد و رشک کی آگ بھڑکتی ہے۔ اور پرخاش و عناد تک ذہن پہنچتی ہے۔ اہل کمال ایک دوسرے کی اچھی بری غزلوں کا جواب دینے کے لئے ایک دوسرے کی خوبیاں یا برائیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح شاعری میں خواہ مخواہ تنزل پیدا ہوتا ہے۔ بہت کم شاعر ہیں۔ جو غالب کی مانند اپنے ہی طرز میں شعر کہیں اور دوسروں کو خاطر میں نہ لا کر علانیہ کہہ دیں کہ

راست سے گویم من و از راست نتوان سرشید

آنچه در گفتار نخر تست آن ننگ من است

بعض شاعر اپنے کلام میں اساتذہ سلف کی شاعری کی خصوصیات بھی پیدا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ جامعیت کے اعتبار سے دیگر شعر پر فائق قرار دئے جائیں +

فرمانی اور مشاعرہ کی غزلیں تصنع کا ایک کھلا ہوا دروازہ ہیں۔ شاعری جذبات کی ترجمانی ہے۔ لیکن مصرع طرح آمد کی جگہ آدھ کو دیتا ہے۔ اس لئے شاعر اپنے حقیقی جذبات و عقاید کو بھول کر فرضی باتیں نظم کرتا ہے۔ جس سے شاعری تصنع کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ شاعر عوام الناس کو خوش کرنے کے لئے انہی کے مذاق کا متبع شروع کر دیتے ہیں اور حقیقی

مشاعری سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

۴۔ عقل اور تخیل

عربی۔ نظیری۔ ظہوری اور بیدل کی لطیف اور ادق شاعری کو دیکھ کر تعجب آتا ہے۔ کہ اردو شاعری ابتدا ہی سے اس قدر آسان کیوں ہے۔ سبب خواہ کچھ ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دلی اور اُس کے معاصرین کی زبان نہایت صاف اور بیان بہت سلجھا ہوا ہے۔ تخیل اُن کے یہاں بھی ہے مگر نہایت لطیف اور سبک سادہ جذبات کو سادہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ قصائد میں بھی اشکال یا گھن دار تخیل نہیں۔ ان کے بعد زیادہ قادر الکلام شاعر میر۔ درویش۔ منظم اور صفحی آتے ہیں۔ اُن کے جذبات میں زیادہ سوز۔ خیالات میں وسعت۔ فہم و فراست میں تیزی اور تخیل میں رنگینی ہے۔ عقل و فہم کی ترقی اس سے ظاہر ہے کہ وہ بلند معارف و حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ افکارِ عالیہ نظم کرتے ہیں۔ اُن کا بیان زیادہ زور دار ہے۔ اور تخیل اگرچہ تخیل سے کچھ یوں ہی متاثر ہے۔ مگر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ شوخ ہے۔

۱۔ تخیل کے لئے یہ شعر ملاحظہ ہوں

بزرگِ حظ سے ترے کامل سرکش نہ دبا یہ زمرِ دہی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
راہِ غریزی میں اے قاتل جو بگستاخِ قوم چلتے چلتے پڑ گئے چھلے تری توار میں
لارہِ خود رو نہیں ہے خون ہے فرما دکا جوش میں آکر لگا دی کوہ کے دس پہاڑ
یہ مزدوری نہیں کہ تخیل ہمیشہ غیروڑوں ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس میں تخیل کی شوکت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔

سو دا۔ انشا اور جرأت کا تکمیل پر شوکت نہیں۔ وہ بھی عقل ہی کے میدان میں جولانی طبع دکھاتے ہیں۔ افسوس ان شاعروں کے فہم شعور نے درست طرف ترقی نہ کی۔ انہوں نے داخلی شاعری کو چھوڑ کر خارجی شاعری اختیار کی۔ جو ریز بحث ذہنی انقلاب یعنی عقل کی تدریجی ترقی کی سب سے بڑی علامت ہے۔ سو دا اب جو سے کام لیتا ہے۔ اور انشا دریائے لطافت لکھ کر اپنی غیر معمولی فہم و فراست کا ثبوت دیتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ طنز اور ہجو کو استعمال میں لاتے ہیں۔ جو خالص شعور کی چیز ہیں ناسخ خارجی شاعری کی بنیادیں اور بھی مستحکم کر دیں۔ اور کوہ کندن کا براؤردن کو اس قدر رواج دیا۔ کہ یہ خاص اُسی کی چیز بن گئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ تخیل سے قطعاً محروم اور نازک خیالی کے میدان کا شہسوار ہے۔ صنعتوں سے دبستگی۔ عقل کے غلط طرف نکل جانے کی علامت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ناسخ نے زبان کو پاک و صاف کیا۔ یہ عقل کی بیداری کی بہت واضح نشانی ہے۔ انتقادی قوتیں اُسی وقت سرگرم کار ہوتی ہیں۔ جب انسان میں شعور کو پہنچتا ہے۔ ناسخ لے جو زبان اور طرز سخن میں ترمیم و تنسیخ کا تہیہ کیا۔ وہ ہوش و خرد کے بلوغ پر دلالت کرتا ہے۔

ناسخ کے بعد گئے سخن ذوق اور غالب کے ہاتھ آئے۔ یہ بھی عقل و فہم کی طرف مایل ہیں۔ جہاں تک غالب کا تعلق ہے۔ یہ دونوں قوتیں ان کی طبیعت میں اپنی پوری شانِ حمالی کے ساتھ موجود ہیں ان کی تکمیل اس قدر ناگوار نہیں۔ پھر بھی یہ ان کی فارسی اور اردو شاعری کی نمایاں خصوصیتوں میں سے ایک ہے۔ آپ کے فلسفیانہ اشعار غیر معمولی

نہم و ذکا کا پتہ دیتے ہیں۔ بخط نویسی کے طرز کو بدل کر بیک گردش قلم صاف
سادہ نشر کو رواج دینا۔ دقیق اشعار کی سبھی ہوئی تشریح۔ جدید رنگ کی
تقریظیں اور تبصرے اور سب سے بڑھ کر قواعد زبان اور الفاظ کی تحقیق
یسی باقی ہیں۔ جو عقل کی تختگی کی خبر دیتی ہیں۔

کیا غدر کا ہنگامہ عظیم معمولی واقعات کی وجہ سے ظہور میں آیا؟
ہیں۔ یہ بھی اس زمانہ کی عام ہوشیاری اور خبرداری کا نتیجہ تھا۔ لوگوں
ہیں اس قدر بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ کہ انہوں نے اپنے ماحول کا مطالعہ
سرو کیا اور غدر پر آمادہ ہوئے۔ بغاوت ان کے احساس تنزل اور
ملاح کار کی ظاہری نشانی ہے۔ ورنہ بیداری ان میں کبھی کی پیدا ہو چکی
تھی۔ سرسید نے غدر سے پہلے 'اثار صنادید' تحریر فرمائی۔ اور آزاد نے
جامع القواعد مرتب کی۔ کیا ان سے پہلے کسی ادیب کو اس قسم کی کتابیں
لکھنے کا خیال پیدا ہوا؟ اصل یہ ہے کہ زمانہ انہیں غدیہ معمولی فہم و فراست کا
بانہ ہے۔ مومن۔ ظفر۔ غالب۔ سب نے اس بیداری کی فضا میں
ندگی بسر کی۔ اور غالباً ذوق نے بھی اس کا اثر محسوس کیا۔

۵۔ علمی ماحول

ایسا زمانہ جس میں میر۔ درو۔ انیس۔ دبیر۔ نظیر اکبر آبادی۔ ذوق۔ مومن
خراور غالب جیسے اہل کمال پیدا ہوئے۔ جہالت کا زمانہ نہیں قرار دیا
اسکتا۔ کیا وہی سے لے کر غالب تک تمام شاعر متنزل ہیں؟ کیا
اس زمانہ میں علم کی روشنی محدود تھی؟ ہم ان سوالات کا جواب نفی
اشبات میں نہیں دے سکتے۔ جس طرح کسی فرد یا قوم کو معقول دلائل

کے بغیر قدامت پرست یا رجعت پسند قرار دینا درست نہیں۔ اسی طرح کسی خاص دورِ ادب کو تنزل کا دور قرار دینا بھی مناسب نہیں۔ مغلیہ حکومت کے زوال بہ مسلمانوں کے ادیار اور بے دست و پائی کو دیکھ کر خیال گذرتا ہے کہ یہ واقعی ایک تنزل کا زمانہ ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا اس وقت کے تمام لوگ جاہل۔ کمزور اور ناتواں تھے۔ یا ان کا ادبار و تنزل فرمانرواؤں کی کمزوری کا نتیجہ تھا؟ مشرقی تاریخ تمام تر بادشاہوں کی تاریخ ہے۔ جمہور کی تاریخ نہیں۔ اس لئے بادشاہوں کی ناتوانی کو رعایا کی ناتوانی قرار دینا غلط ہے۔ جن باہمت لوگوں نے غدر کے عظیم الشان محاربات میں حصہ لیا اور غیرت قومی کے زیر اثر قوم و وطن کے ناموس پر کٹ کر اُن کو بزدل، مرل اور جاہل نہیں کہا جاسکتا۔

اگر ہم تاریخ سے شاعری کی طرف رجوع کریں۔ جو سوسائٹی کی باطنی زندگی کی منظم تاریخ ہے۔ تو ہم کو پھر یہی مشکل پیش آتی ہے۔ قدیم اردو شاعری کا زیادہ حصہ ناقص ہے اور اعلیٰ اخلاق کی خبر نہیں دیتا۔ مگر اس کے ساتھ ہمیں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جن سے علیٰ اخلاق کا بہترین معیار قائم ہوتا ہے۔ اگر تصوف کے اثر کا نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس سے اخلاق اور روحانیت کو بہت تقویت پہنچتی ہے۔ لیکن انسان مدنی حیثیت سے ناکارہ بن جاتا ہے۔ تو ہمیں اس ترقی و تنزل کے یکجا ہونے کا ایک سبب ماننا پڑتا ہے۔ مگر علم کی کمی کا سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔

زمانہ ماقبل غدر میں علمی فضائیں روشن نہ تھیں۔ شعر کا حلقہ خیا

محدود تھا۔ درسیات فارسی شعر کے دواوین اور چند علوم تک محدود تھے۔ دیوان خانہ
 گلستاں بوستاں، مثنوی مولانا کے روم، تصنیفات، مولانا کے جامی، اور متاخرین
 شعرائے فارسی کا کلام، تمام مبتدی و منتہی طلبہ کے نصاب تعلیم میں داخل قرار
 صدیاں گزر گئیں، لیکن ان میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ یونانی حکمت جہاں تھی۔ وہیں
 رہی۔ کسی نے مزید تحقیق یا معلومات بہم پہنچانے کی کوشش نہ کی۔ اس کا سبب تین
 قومن کی سلف پرستی ہے۔ جو ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ اسلاف کی کسی بات پر اعتراض
 نہ کیا جائے۔ اور ان کی ہر بات کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے۔ یہ جو دس زائد
 میں زندہ گی کے سرشعبہ کو محیط ہے۔ علم و ادب خاص طور پر اس کے زیر اثر ہیں۔
 شعرا کو نغم اور فن کے اصولوں میں ترمیم و تنسیخ کی اجازت نہیں۔ اور جس طرح
 آج کل اہل زبان ظاہری باتوں پر لے دے کرتے ہیں۔ اُسی طرح اس زمانے
 میں بھی زبان محاورہ اور بندش وغیرہ پر اعتراضات کئے جاتے تھے۔
 ترقی پسند قوموں کی علمی و ادبی سرگرمی اقدام اور نشاۃ کار کا اثر ہوتی ہے،
 لیکن ہماری شاعرانہ محفلوں کی رونق زوال پذیر قوتوں کا نتیجہ ہے۔ دیبا میں
 پانی کی موج اٹھتی ہے۔ تو پہلے وہ اپنے زور سے انتہائی عروج تک پہنچتی
 ہے اور پھر صرف شدہ قوت کی مدد سے اُسی زور کے ساتھ فرو ہو جاتی ہے۔
 مگر یہ زور حقیقت میں فاعل نہیں ہوتا۔ یہ ایک عمل کا رد عمل یا معکوس زور ہے۔
 اسی طرح متنزل قومیں بھی بعض عظیم الشان کام سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہی
 حالت ہندوستان کے زوال پذیر مسلمانوں کی ہے۔ ان میں جو بعض برگزیدہ
 نفوس پیدا ہوئے۔ ایک بھتی سیونی آگ کے شعلہ تھے۔ ان کی ادبی سرگرمیاں
 ایک ترقی پذیر قوم کے میل راہ اور نشاناتِ رُوح نہیں۔ رع
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ان امور سے ظاہر ہے۔ کائنات کے لوگ بالکل بے شعور اور بے علم تھے مگر ساتھ ہی صحیح معنوں میں ذی علم اور خبردار بھی نہ تھے۔ کسی ملک یا قوم کے لوگ ذہین ہونے کے باوجود ناواقف اور بے خبر ہو سکتے ہیں۔ اس زمانہ کے لوگوں میں جدت کا مادہ کم تھا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں۔ ان کے سوا واقعات کا کوئی اور پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ میر غالب اور درّود جیسے اعلیٰ شاعروں کو جاہل یا ان کے زمانہ فروغ کو چھانٹنا کا زمانہ قرار دینا بجا نہیں۔ لیکن حقیقی خبرداری اور ہوشیاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو باخبر یا ناواقف کہا جائے۔ تو اس سے ان کی تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا۔ ظاہر ہے کہ میر۔ غالب اور ذوق کو ان علوم کی تعلیم نہیں دی گئی۔ جن سے انسان کا دماغ بیدار ہوتا ہے۔ اور وہ بطور خود زندگی اور قدرت کے مسائل پر غور و فکر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جزا فیہ ہی کو ایچے۔ قدیم شعر کے جزا فیانی معلومات بہت ہی معمولی تھیں۔ اس وجہ سے وہ دنیا کے معاملات پر ابھی طرح رائے زنی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے خیالات میں وسعت کا پیدا ہونا بہت مشکل تھا۔ اسی طرح علم نباتات و حیوانات۔ علم النفس۔ علم معیشت تاریخ۔ فلسفہ اور سائنس وغیرہ سے ناواقفیت انسانی دماغ کو ایک فالووس میں گھرا ہوا اجزاغ بنا دیتی ہے جس کی روشنی کا غذی دیواروں سے دور نہیں جاسکتی۔ ان حالات سے ظاہر ہے۔ کہ ذوق۔ ظفر۔ مومن اور غالب کا ماحول روشن نہ تھا۔ اس میں بیدار کرنے والی باتیں بہت کم تھیں۔ لوگ ضروری اور اہم علوم سے بے خبر تھے۔ ان کے نصائے تعلیم میں مفید اور اثر آمیز باتوں کی بہت قلت تھی۔ شعر و شاعری کی تعلیم ان کی معلومات کے مطابق اچھی کہی جاسکتی ہے۔ مگر یہ بھی ایسی عمدہ تعلیم نہ تھی کہ ان پر شعر کی ماہیت اور فرائض واضح کر سکتی۔

نظام تعلیم حکومت کی طرف سے نہ تھا۔ مگر علمی ضروریات مکتبوں کے ذریعہ سے بہت اچھی طرح پوری ہوتی تھیں۔ ہمارے خیال میں جو خوبی اُن کے طرزِ تعلیم میں تھی۔ وہ ہم آج بھی مبلغِ اہتمام کے باوجود جدید نظامِ تعلیم میں پیدا نہیں کر سکے۔ اس زمانہ کے معلموں کا طرزِ تدریس بہت اچھا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو بہت محنت اور جانفشانی سے پڑھاتے تھے۔ اور اُن میں صحیح ذوق۔ دلچسپی اور علمیت پیدا کرتے تھے۔ مگر جب تعلیم کے نصاب ہی میں وسعت نہ ہو۔ تو اُسنادوں کی جدوجہد کیا اثر پیدا کر سکتی ہے؟

موجودہ اخبارات۔ ٹیلیفون اور لاسلی کے زمانہ میں ہم یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ اس زمانہ میں اطلاع اور رسلِ رسائل کا انتظام نہایت ناقص ہو گا۔ یہ خیال درست نہیں۔ اخبارات اس زمانہ میں بھی موجود تھے۔ لیکن ان سے صرف خبررسانی کا کام نبھاتا تھا۔ خیالات اور سیاسی مسائل وغیرہ کی اشاعت نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اردو شعرا کی دنیا میں وسعت۔ حدت۔ آزادی اور تازگی نظر نہ پیدا ہو سکی۔ معاشرت و معاشرت وغیرہ پر غور و فکر نہ کر سکے۔ اُن کی طبیعت تحقیق و مسائل کا ذوق نہ پیدا کر سکی۔

تنقید کی زندگی کے ہر شعبہ میں ضرورت ہے۔ یہ انسان کو سوچنے سمجھنے اور غور و خوض سے کام لینے میں مدد دیتی ہے۔ اس زمانہ میں تنقید کی زبان جبراً بند کر دی گئی تھی۔ اہل قلم بے سوچے سمجھے جو کچھ جی میں آتا۔ کہہ جاتے۔ اُن حالات میں اُن کے گمراہ ہونے کے اسباب زیادہ اور اصلاح و تہذیب کے ذرائع بہت کم تھے۔

جس طرح افراد کا آپس میں اختلاط تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہے اسی طرح اقوام کا آپس میں میل جول ترقی کا باعث ہے۔ جو قوم دوسروں سے علیحدہ

رہے گی۔ اُس کی معلومات اور تخیل محدود رہیں گے۔ یونان۔ ہندوستان تبت اور چین کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ ملک کی چار دیواری میں محدود رہنے کی وجہ سے ان کے خیالات میں وسعت نہ پیدا ہو سکی۔ مختلف نسلوں کے امتزاج سے ایک نئی فضا۔ نئے اطوار و خصایل اور نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ علوم و فنون کی توسیع ہوتی ہے۔ تخیل اور ذہن کشادہ ہوتے ہیں ہندوستان شروع ہی سے دیگر ممالک سے علیحدہ ہے۔ اس لئے اس کے تمدن میں وسعت نہیں پیدا ہو سکی۔ چین اور یونان کے تہذیب و تمدن کی طرح یہ بھی مقامی رنگ لئے ہوئے ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلمان۔ ہندوؤں سے ملے تیار گئے۔ جتنا۔ گنگا سے متوصل ہو گئے۔ دونوں کا پانی مشابہ ہونے کی وجہ سے کوئی تیار رنگ نہ پیدا کر سکا۔ نہ مسلمانوں میں زیادہ بیداری۔ وسیع النظری اور روشن خیالی پیدا ہوئی۔ نہ ہندو مسلمانوں سے متاثر ہوئے۔

بے امیز مذہبی تعلیم انسان کو تنگ نظر اور متعصب بنا دیتی ہے۔ یہ اُس کو زندگی۔ انسان۔ فطرت اور سوسائٹی کے متعلق کچھ نہیں بتاتی۔ بلکہ اُس کو مذہب کے پختہ رنگ میں اصطلاح دے کر باقی سب رنگوں سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ مذہبی تعلیم کے تربیت یافتہ لوگوں کا نقطہ نظر محدود ہوتا ہے۔ اُن کی طبیعت تنگ۔ آزادی اور وسیع الشرفی سے نامانوس ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اور لوگوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ زہد اور عابد عموماً نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور شعرا اُن کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ زمانہ میں زندگی کی تڑپ نہیں ہوتی۔ اُن میں تہذیب کا مادہ فنا ہو جاتا ہے۔

مسلمان ابتدائی سے مذہب کے دلدادہ ہیں۔ ہندوستان میں یہ اہمیت۔ تنگ نظری اور توہم پرستی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بظاہر مذہبی تعلیم افلاک عالیہ

کامیاب و سرچشمہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے یہ اس زمانہ میں صلاح کار کا ذریعہ نہ بن سکا۔ مذہب کی شدید پابندیوں کے معکوس اثر نے لوگوں کے جذبات اور خیالات کو پست کر دیا۔ ایشیائی فطرتاً حسن پرست ہیں۔ جب مذہب نے ان کو رندی اور عیش پرستی سے روکا۔ تو اس جبر و تحکم نے خفیہ ہوسناکی اور بداخلاقی کی شکل میں رو نما ہو کر اپنا انتقام لیا۔

انیس۔ دبیر شیکسپیر۔ ہوسراور تردد کسی صرف اپنی روشنی طبع کی بدولت بڑے شاعر نہیں بنے۔ وہ عظیم نشان تحریکات کے مظہر اتم ہیں۔ جب کسی قوم یا ملک میں علوم و فنون اس قدر پھیل جاتے ہیں۔ کہ عام مذاق اور طباعی بھی درجہ خاص کو پہنچ جاتی ہے۔ تو اہل ادب کا وجدان و ذوق پختہ تر اور کمال تر بن جاتا ہے۔ دہلی میں ایسی نو پرورد فضا کبھی نہیں پیدا ہوئی۔ یہاں کے سب شاعر اپنی طبیعت ہی کے معدنیات کو صفحہ و ورق کے طشت پر جلوہ گر کرتے رہے۔ ذوق عامہ کی ایک روز در معرض وجود میں آئی جس کا ہم صفحات گذشتہ میں ذکر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے عام بول چال اور معمولی مضامین کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور سخیفت سنجیدگی پر غالب آگئی۔

داروڈ لہوری کا زمانہ حکومت انگلشیہ کا جدید نظم و نسق رائج کرنے کے لئے مشہور ہے۔ جدید مغربی اثرات اسی زمانہ سے شروع ہوتے ہیں۔ ہمالا خیال ہے کہ غالب کی غیر معمولی جدت طرازیوں میں ان اثرات کو براہ راست نہیں تو بلکہ واسطہ کچھ دخل ضرور ہے۔ آپ کے رقعات میں ڈاک۔ ہرکارہ تاریخیں پراسر جیسے الفاظ و نظموں میں تاریخی واقعات کو بالتقریب قلمبند کیا گیا ہے ان باتوں سے ظاہر ہے۔ کہ اس زمانہ میں ہندوستان نئی روشنی سے بہت کچھ روشناس ہو چکا تھا۔ اور وہ فضا پیدا ہو چکی تھی جس سے موجودہ ہندوستان

اس قدر مانوس ہے +

۶۔ ملکی و سیاسی حالت

اورنگ زیب کے ساتھ باہر کی نسل کا ستارہ ماند پڑ گیا۔ اُس کے بعد ملک میں اس قدر طوائف الملوکی پھیلی کہ کوئی بادشاہ چند برس سے زیادہ تخت پر متمکن نہ ہو سکا۔ امرانے فرمانرواؤں کو معزول کرنا شروع کیا اور فتنہ انگیزی سے ملک میں نہایت ابتری اور پریشانی کی فضا پیدا کر دی۔ سلطنت دروزبروڑ ایک فرو ہوئے ہوئے سیداب کی مانند سمٹی گئی۔ مرہٹوں۔ رہیلوں اور قزاقوں نے ملک میں شورش پیدا کی۔ بیرونی حملہ آور نے میدان صاف دیکھ کر تاخت و تار اور لوٹ مار کے لئے تیار ہوئے۔ بے دست و پاہ عایا کو عجب مصیبت کا سامنا تھا۔ نہ وہ بادشاہوں کا جواگردن سے اتار کر پھینک سکتی تھی۔ نہ خود ان گوناگون آفات کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ معاش۔ ربایش آرام و آسائش سب کی طرف سے پریشانی دامنگیر تھی۔ اور اس پر طرۃ یہ کہ جفا کار عمال نے حکومت اعلیٰ کی باز پرس سے بے خطر ہو کر عایا پر مظالم توڑنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس پر آشوب زمانہ میں کون تھا۔ جس کو طمانیت قلب حاصل ہو؟ کون تھا۔ جو گوشۂ آرام میں بیٹھ کر غور و خوض کرے؟ کوئی مرتی شعر کا پڑسان حال نہ رہا۔ خود بادشاہ آوارہ و پریشان تھا۔ مرہٹوں اور رہیلوں نے اُس کو دام بلا میں چسایا اور غلام قادر بہیلہ نے تو جہاں تک ستم کیا کہ اُس کی آنکھیں بھی نکلوا دیں آخری بادشاہ بد نظربہا در شاہ تھا۔ وہ ایک اچھا اور ہوشمند انسان تھا مگر اب اُس کی طاقت ہی کیا تھی؟ وہ اب صرف انگریزوں کا پیش خوار اور قلعہ کا حاکم تھا۔ پوری دہلی بھی اُس کے قبضے میں نہ تھی۔ قلعہ میں کچھ امن تھا۔ اور

علم و ادب کے بہت چرچے تھے۔ لیکن یہ بزم بھی چند دنوں کی بہان تھی۔ وہ سیلاب رنک جس نے تمام ملک کے نقشہ کو سرخ بنادیا تھا۔ کوئی دن میں اس دھندلے سے نقطہ یعنی قلعہ کو بھی جذب کرنے والا تھا۔ جلد ہی سیلاب جہاں آباد کی دیواروں تک پہنچا۔ اور قلعہ کو ایک حباب کی طرح وارپ کر لیا۔ اندر کے کچھو کچھ نے مغلیہ حکومت کے جھلکاتے چراغ کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ اسلامی دنیا پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔

۷۔ معاشرت اور مذہب

اس زمانے میں سوسائٹی کا ایک اہم حصہ۔ بے کار تھا۔ عورتیں پردہ میں بٹھائی جاتی تھیں۔ ان کو تعلیم دی جاتی تھی۔ نہ مجلسی زندگی کو بہتر سامنے کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔ تصوف غلش مجازی یعنی امر و پرستی بن کر تمام ملک پر چھا گیا۔ ان عمالات کی وجہ سے اخلاقی و عبادت بھی رخصت ہو گئی۔ تصوف کی بدولت توکل و تہجد نے بھی عمر میّت حاصل کی۔

مذہب کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ ان دنوں مشرق کی جہلی ظاہر پرستی زور پر نشی۔ فروعیات کی پیروی۔ مرقاہ پرستی۔ اور گوشہ نشینی کا جادو کارگوں ہو چکا تھا۔ لوگ دشمنان وطن کی تباہ کن تدبیروں کا مقابلہ تقدیر سے کرتے تھے۔ اخلاقی خوبیاں کم تھیں۔ تناعت۔ نیکدلی۔ پرہیزگاری۔ صلح کل۔

وسیع النظری۔ بے تعصبی اور دارلحد مزاجی جیسی خوبیاں ضرور تھیں۔ جن سے ایک قوم تاریخ کے صفحے پر اپنا نقش ثبت کر سکتی ہے لیکن چونکہ اس زمانے میں ذائقہ ان سے بہت زیادہ تھے۔ اس لئے اخلاقی فاضلہ کی ان کے سامنے کچھ پیش نہ پاسکی۔

۸۔ متفرق امور

دہلی ایک مرکزی مقام ہے۔ ہر طرف سے آنے والوں کا رہنما ہے۔ آبادی ملی جلی ہے۔ ہر مذہب۔ قوم اور کیش و ملت کے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اور ایک آزاد فضا پیدا ہوتی ہے۔ روز داری اور وسیع المشرقی کو تقویت پہنچتی ہے۔ لکھنؤ جیسے دور افتادہ مقام میں یہ آزاد خیالی کی فضا نہیں پیدا ہو سکتی۔ عیش پسندی اور رندی اس زمانہ کے روٹ سا کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اس کا عوام پر بھی بہت اثر ہوا۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لہو و لعب میں گزرتا تھا سہل انگاری۔ تراکت اور کھف ان کی زندگی کا جزو و لا ینفک بن گئے پنجاب کے باشندے عادات و خصال میں اہل زبان سے بہت مختلف واقع ہوئے ہیں۔ وہ کم سخن اور غور و فکر کے دلدار ہیں۔ دینی اور یو سکی کے باشندے شوخی۔ تیز بینی اور طاری کو پسند کرتے ہیں۔ گراہل زبان میں تخیل اور قیاس فکر نہایت کم ہے۔ غائب کے سوا کسی کا تخیل بلند نہیں اور ان کی نسبت ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک فوار ترک تھے۔ جو طبیعت کے لحاظ سے پنجاب کے زندہ دل باغی۔ دس کے ساتھ بہت مناسبت رکھتے ہیں۔

جب تخیل اور رنگیں مزاجی نہ رہی تو رومان کہاں؟ یہ بھی اہل پنجاب ہی کا حصہ ہے۔ حقیقت کا پنجاب درست کہتا ہے کہ

اس میں پہچانے دے مرے آباد ہیں تباہ ہیں دونوں کنارے ہر طرح موٹا ہیں
ان کے دل روشن ہیں کچی دھوپ کی آگ سے ان کے گیتوں کی صداقتی ہے میرے ساک سے
میرا فساد بندھا ہے ان کے افسانوں کے ساتھ آہ جیسے طبع دابستہ ہے پر دانوں کے ساتھ
حسن و صورت۔ عشق و الفت کا نیر کاں اس جگہ ہر طرف آباد ہیں سو مہنی ہینول اس جگہ

ٹوٹے ہیں میری موجوں پر کئی کچے ٹھٹھے روز دکھلاتے ہیں کائنات نئی کچے ٹھٹھے
 یہ ہوا لہروں سے جو خوشگفتار بستیاں ہر نئے رانچے کی مٹھی بانسری سے مست
 گھیرتی ہیں مجھ کو ان سادہ دلوں کی ٹویا بھولی بھولی صورتیں ہیں ٹٹھی مٹھی دلیاں
 مختصر یہ ہے کہ الفت ہے مجھے پنجاب سے

خوش ہوں میں پنجابیوں کی شورش بیتاب
 ماں یہ سرزمین حسن و عشق - لطف و کیف - سرسبزی و شادابی کی سرزمین ہے -
 یو۔ پی۔ دلی - علی گڑھ اور حیدر آباد اس کی نگینوں سے نا آشنا ہیں +
 گیت اور روان لازم و ملزوم ہیں - پنجاب آج بھی گیتوں اور نغموں کا گھر
 ہے - فاخر ہریانوی درست کہتا ہے کہ

جن کو کچھ کچھ ہیر کا حصّہ ربانی یاد ہے
 اُن کی پُر تاثیر تانوں سے فضا آباد ہے
 اس پانچ دریاؤں کی زرخیز - حسن خیز اور عشق خیز زمین میں اب بھی گیت
 اُگتے ہیں - اور موسیقی برستی ہے - ہر دلعزیز اُن پڑھ شاعر اُچھ کر عام لوگوں
 کے حسیات کی ترجمانی کرتے ہیں - اُن کی شاعری میں تصنع نہیں - یہ فالص
 جذبات اور فطرت کی شاعری ہے - یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے - کہ
 اُردو زبان کی بہترین نظم و نثر کی تصنیفات پیدا کرنے کا مہر پنجاب کے سر
 ہے - سرسید مرحوم نے اہل پنجاب کو بلا وجہ زندہ دل نہیں کہا - آپ نے
 جس چیز کا دیگر مقامات میں قحط پایا - یہاں اس کثرت سے نظر آئی کہ وہ
 اس کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے +

لکھنو اور دلی کا باہمی مقابلہ بڑی دیر سے چلا آتا ہے - اتنا ظاہر ہے کہ
 لکھنو میں سب سے قبیح ادبی روایات اور طرز پیدا ہوئے اس کے مقابلہ

میں دہلی کو رد و عاقبت اور معنی نوازی پر نالہ ہو تو بیجا نہیں۔ کیونکہ یہ کچھ نہ کچھ داخلی شاعری کی طرف ضرور مایل ہے +

اخذ نتائج

ذوق کی طبیعت پر ماحول کا اثر

علم النفس کے جدید ماہرین کی رائے ہے۔ کہ خارجی اثرات انسان کی طبیعت میں بہت کم تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ بڑے ہو کر ہر شخص کی فطرت وہی قوتیں اور میلانات پیدا کرتی ہے۔ جو خلقی طرز پر اُس کی طبیعت میں مضمر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ماحول کی بصیرت افروزی دماغ کو زیادہ روشن کر دے۔ آخر کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ علم انسان کے تخیل کے لئے سامان حیات ہے اور لوہن اور آگ کے لئے ہمیز کا کام دیتا ہے۔ ہمارے تخیلات کی وسعت معلومات کی وسعت کے مطابق ہے۔ لیکن ان ابتدائی اثرات سے قطع نظر کرنی چاہئے تو معلوم ہو گا۔ کہ خارجی اثرات انسان کی طبیعت یا تخیل پر میں زیادہ تصرف نہیں کرتے۔ غالب ہر زمانہ میں غالب ثابت ہو گا۔ اور مستحق تصحیفی

اُس الکثاف کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذوق نے جس شخصیت کا انحصار کیا۔ وہ جو ذاتی خیالات اور عادات و خصایل اُس کی شخصیت کے ساتھ منسوب کئے جاتے ہیں۔ بڑی حد تک وہی ہیں۔ جن کی طرف اس کی طبیعت شروع سے مائل تھی۔ اُس نے بیرونی اثرات کو قبول کیا۔ مگر تا مگر اپنے مزاج اور فقا و طبیعت کے مطابق۔ بعض انسان سادہ و رِق کی سی فطرت سے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اور خارجی واقعات اُن کو ایک خاص رنگ میں

رنگ دیتے ہیں۔ بعض لوگ اس قدر آزاد مزاج اور بلند شخصیت رکھتے ہیں کہ وہ اپنی طبیعت کے اشارے پر چل کر خارجی واقعات کی پروا نہیں کرتے۔ اگر تمام دنیا اُن کو غلط رو خیال کرے تو وہ اپنے آپ کو راست رو اور اہل زمانہ کو گمراہ خیال سمجھتے ہیں۔ ان دو قسم کے لوگوں کے عطا وہ ایک اور قسم کے انسان وہ ہیں۔ جن کی طبیعت کا میلان ایک خاص طرف ہوتا ہے۔ وہ اس میلان کے مطابق جواڑ بھی ہو۔ قبول کرتے ہیں۔ اور دوسروں سے غیر متاثر رہتے ہیں۔ ذوقِ تیسری قسم کے انسانوں کا نمائندہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُس نے خارجی اثرات قبول کئے لیکن یہ اثرات تمام تر اُس کے جہنی مذاق اور رجحانات کے مطابق ہیں۔ دیگر تا اثرات سے اُس کی طبیعت بالکل بیگانہ رہی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شروع ہی سے اُس کے میلانات اور مرغوبات کیا تھے۔ یہ الفاظ دیگر اُس کا مذاق کیا تھا؟ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذوقِ خلقِ عالی نشی نہیں۔ اُس کی طبیعت ذوقِ عامہ کی طرف مائل ہے۔ وہ شروع ہی سے گھریلو شاعری۔ زبان اور خیالات کا دلدادہ ہے۔ اُس کا ذہن فلسفہ جذباتِ عالیہ اور شستگی سے دور رہتا ہے۔ اور اُس کی طبیعت میں بہت کچھ و ناعت ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ فطری طور پر اخاذ۔ وضع کا پابند۔ اصولوں کا عاشق یا اخلاق مسکین مزاج اور ظاہر پرست ہے۔ وہ اپنے ہم جنسوں کی محبت عزیز رکھنا ہے۔ گھر میں بھی اہل خانہ کے ساتھ کھل کر باتیں کرتا ہے۔ اور باہر بھی نشت و براست۔ میل جول اور گفتگو کا دلدادہ ہے۔ وہ زندگی کے عام مشغلوں میں نہایت شوق سے حصہ لیتا ہے۔ شاعری کے لحاظ سے طبیعت خاصی سوز و ہے۔ مگر قوتیں اعلیٰ نہیں۔ اس سرشت کا انسان لازماً خاص قسم کے اثرات قبول کرے گا۔ جو اُس کے ذوق اور طبعی میلانات کو زیرِ تقویت

بخشیں گے۔ مگر ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے۔
 ذوق کی بد قسمتی تھی کہ وہ ایک ادنیٰ گھرانے میں پیدا ہوا۔ فطرت کی طرف
 سے اعلیٰ و ادنیٰ، شریف و ذلیل کی کوئی تفریق نہیں۔ پھر بھی عام طور پر دیکھا
 جاتا ہے کہ خاندانی شرافت کا انسان کی فطرت پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ خواہ
 سائنس موید ہے کہ نسلی اثرات ہماری طبیعت کے ہر رگ و ریشمہ میں
 طلعتی ساری ہیں۔ یہ سوہوم نفوذ و اثر تو کیا۔ خود ادنیٰ گھرانوں کی تربیت اور فضا پرست
 رجحانات اور عادات و خصایل پیدا کرتی ہے۔ یہاں امیری غریبی کا مقابلہ مقصود
 نہیں۔ بلکہ سجاہت اور دناعت کا اثر زیر بحث ہے۔ اس خصوص میں ہر صاحب نظر
 تسلیم کریگا کہ جہاں تک تربیت ذوق اور علیہ اخلاق کا تعلق ہے۔ ایک شریف
 خاندان کے افراد تہذیب، مذاق اور عادات و خصایل میں دوسروں کی نسبت
 ضرور بہتر ہوں گے۔ ادنیٰ گھرانوں میں والدین بچوں کی اچھی طرح نگہداشت
 نہیں کرتے۔ بلکہ خود ان کی عادات کو بگاڑتے ہیں۔ وہ ان کو اراذل کی
 صحبت سے باز نہیں رکھتے۔ اس لئے اطفال اپنے اسفل ہجویوں سے
 مل جل کر آوارہ مزاج ہو جاتے ہیں۔ ان کا مذاق پست ہو جاتا ہے اسی
 طرح والدین کے اثر سے مذہبیت، توہم پرستی، تنگ نظری اور سفلی بھی
 بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں سرایت کر جاتے ہیں۔ اس لئے بڑے ہو کر
 وہ ان کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ شاعر یا ادیب واقع ہوتے
 ہیں۔ تو ضرور ہے کہ وہ مذاق، خیالات، با جذبات میں کمی نہ کسی طرح اپنی
 پست فطرتی کا اظہار کریں۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ گفتار اور نشست و برخاست
 میں بھی تہذیب و متانت کا خیال نہ رکھ سکیں۔ مغلی اور سے ذری
 کا اثر بالخصوص بہت برا ہوتا ہے۔ اگر غرض قسمتی سے ایک بے برگ و لیا

شاعر کی کسی امیر کسیر تک رسائی ہو جائے۔ تو اُس کی حرص کے پاؤں بقدر وسعت پھیلنے جائیں گے۔ جتنی اُس کا انعام و اکرام کی بارش ہوگی۔ اتنی ہی اُس کی طمع میں اضافہ ہوگا۔

ذوق بچپن ہی سے تنگ نظر مذہبیت۔ زہد خشک۔ اور عامیانا ذوق کے پھندوں میں گرفتار تھا۔ وہ عوام سے رسم و راہ رکھتا تھا۔ اس نے ہم لوگوں کے عادات و خصایل۔ اور متاع و اطوار۔ اور طور و طریق اختیار کئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اُن کے مذاق اور زبان کا دلدادہ ہو گیا۔ اس لئے محاورہ لہا و تیس اور تمبیحات جو عوام کا متاعِ فاس ہیں۔ اوایل عمر ہی میں اُس کی طبیعت پر چھا گئے۔ تمام وہ کھیلیں جو عوام کو پسند ہوتی ہیں۔ ذوق کو بھی پسند تھیں۔ وہ بچپن میں ان کا نہایت مشتاق رہا اور بڑے ہو کر اُن کو اپنے شعار میں جگہ دی۔ چنانچہ لکھتے ہیں

مگر گئے جس کی طرف جوں گل بازی میں
باس آنے نہ دیا دور ہی پھینکا ہم کو
ہی ہر طرح سے میدی کے کبوتر کی طرح
ہاتھ سے اُس بُت بے درد کے ایذا ہم کو
ہو بار مر کے عاشق جاں باختہ ترا
ڑنے کو پھر کھڑا روشِ نرزد ہو گیا
پوچھتا ہے تو عملِ بغض و محبت
چلتا ہوا تعویذ سمجھ نقشِ قہر کو
نہ سلب آنکھیں میں خواب آیا خیالِ غلِ بگلوں سے
رہے بیدار ساری رات ہم اک حبِ انیوں سے

عوام سے اختلاف کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ ذوق کی عادتیں اور مذاق اصلی حالت پر مبنی نہ رہ سکے۔ اُس کی طبیعت کی روشنی مدہم ہو کر دوسروں کی روشنی میں مدغم ہو گئی۔ اہل کمال کے لئے لازم ہے۔ کہ وہ دنیا کو دور رکھیں۔ اُس کے مشاغل میں خود حصہ نہ لیں۔ کیونکہ اس طرح اُن کی

قوتوں کے مضحمل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ذوق نے دنیا کے مشاغل میں حصّہ لیا اور انہی کا ہو رہا۔ اُس کی طبیعت کے داخلی رجحانات پر ایک کاری ضرب پڑی۔ وہ خارجی اثرات کے ہاتھوں بالکل فنا ہو گئے۔

ذوق کو قسمت نے بڑے بڑے امیروں کا مصاحب بنایا۔ یہاں اُس کی خودداری کا امتحان تھا۔ مادی ترغیبات کے آگے روحانی اور اخلاقی رفعتیں کوئی طاقت نہیں رکھتیں، انہوں نے ذوق کو قعرِ ندلت میں غرق کر دیا۔ اور وہ روحانی وجاہت کو چھوڑ کر بندۂ مال و زر بن گیا۔

حافظ غلام رسول ایک صاحبِ ذوق شاعر نہ تھا۔ اُس کا اثر بھی نوآموز شاگرد پر اچھا نہ ہوا۔ غالباً ذوق کے مطالعہ میں وہی کتابیں آئیں۔ جن سے مذاق کے سلجھنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اُس کو شروع ہی سے فارسی کتابوں کے ساتھ رغبت نہ تھی۔ وہ عام روزمرہ کی طرف مائل تھا۔ فالص اردو جس میں فارسی کی آمیزش نہ ہو۔ ایک پھکی زبان ہے۔ اردو کی تمام لطافت اور ترنم فارسی کا شرمندہ احسان ہے۔ شیخ فارسی سے مانوس نہ تھے۔ اس لئے وہ اپنی شاعری میں حسن و لطافت نہ پیدا کر سکے۔

عوام الناس بہذب عاشق سے نا آشنا ہیں۔ اُن کو عامیہ نہ عشق و محبت پسند ہے۔ ذوق نے انہیں سے محبت کرنا سیکھا۔ اس لئے لازماً اُس کی محبت بلند پایہ نہیں ہو سکتی۔

دہلی مدت سے تکلف دوست اور وضع کی پابند ہے۔ ذوق نے ابھی مضمونِ طفلی کا ورق نہ اٹھا تھا۔ کہ اُس کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ جو شدت سے آداب معاشرت۔ اور فائنٹی و شہری زندگی کے قواعد و ضوابط کی پیروی کرتے تھے۔ اس لئے وہ انہی کی طرح مہسوم و قیود کا پرستار بن گیا۔

لے اس سے ہمارا یہ مہسوم نہیں کہ فالص اردو میں شعرت اور دلاوری کا پھیلا ہوا محال ہے۔

ذوق کو قسمت نے دیبھدر سلطنت کا مصاحب خاص بنایا۔ جس کو
جراث۔ انشا اور سودا کا انداز پسند تھا۔ اگر ذوق کو ان کا طرز پسند نہ ہوتا۔ پھر
بھی وہ دیبھدر کی خاطر سے ان کے قلمیج پر مجبور تھا۔ مگر یہاں تو حالت ہی
اور محی۔ ذوق خردان کے طرز کا مداح تھا۔ اس لئے وہ انہی کے رنگ میں
شعر کہنے لگا۔ بدیں وجہ اس کے اشعار میں ظاہریت زیادہ اور داخلیت
نہایت ہی کم ہو گئی۔

ذوق نے ایرانی شعرا میں سے بہت کم شاعروں کا اثر قبول کیا۔ اس کو
ما فطر۔ نظیری۔ عربی وغیرہ کے طرزوں سے کوئی نسبت نہیں۔ وہ صاحب
کی شاعری کا دلدادہ ہے۔ اور وہ بھی ایک خاص حد تک۔ وہ مثالیہ شاعری
میں اس کا مقلد ہے۔ لیکن سلیم الفطرتی۔ ذوق صحیح۔ اور افکار عالیہ سے گریز کرتا
ہے۔ وہ نظیری و صاحب کی طرح عام زندگی کا مشاہد بھی کرتا ہے۔ مگر انکی اندر اپنی مغلز کو خوش سلوئی استعمال نہیں کرتا
شیخ نے خیاں ہند شاعروں کا بھی ایک خاص حد تک قلمیج کیا۔ وہ کوہ گند
کاہ برآوردن کا اس قدر شائق نہیں۔ لیکن مضمون آفرینی آپ کی کشت طبع
کی ایک نظر گیر پیداوار ہے۔ وہ نازک خیالیاں کثرت کے ساتھ نظم کرتے
ہیں۔ اور اس عشیت سے کسی ہندی شاعر سے پیچھے نہیں۔

قصیدہ میں آپ نے کسی ایرانی شاعر کا قلمیج نہیں کیا۔ لیکن ان کے
قصائد آپ کے سامنے تھے۔ وہ ان کے مبالغہ۔ طخیٹل اور مضامین کو دیکھ
کر اس نتیجہ پر پہنچے۔ کہ قصیدہ کو ہمیشہ مبالغہ آمیز اور پر قنع ہونا چاہیے۔
اس لئے اگرچہ وہ ایرانی قصیدہ نگاروں کا قلمیج نہیں کرتے بھر بھی ان کا
نفس ناطقہ ان کی شاعری کے قالب میں صریحاً بندھ پیرا ہے۔

ہندوستانی شعرا میں وہ سب کے مقلد ہیں۔ صرف اپنے حریف غالب

کاشع نہیں۔ اُن کا فارسی آمیز اور نکتہ سخا نہ طرزِ شیخ کو پسند نہیں۔ وہ
 کبھی کبھی تیسر کی سادگی کی طرف بھی فلفلہ اندازِ نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر
 انشاء سودا۔ جرأت اور ناسخ ہی کے چمنِ دار کی سیر کرتے ہیں۔ ناسخ کو گویا
 اُن کا پیر و مرشد ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے۔ شیخ اُس کو اپنی شاعری کا وظیفہ
 بنا لیتے ہیں۔ انہوں نے صائب۔ خیال ہند شعراے ایران۔ انشا۔ سودا
 اور جرأت وغیرہ سے جو کچھ استفادہ کیا ہے۔ ناسخ ہی کے ذریعہ سے کیا
 ہے۔ تخیل۔ مثالیہ شاعری۔ جوشِ خام۔ سنگلاخِ زمینیں۔ غرضیکہ ہر چیز
 اُن کے پاس ناسخ کی وساطت سے پہنچی ہے۔ اس لحاظ سے ذوق کو دہلی
 کا ناسخ یا جانشین قرار دینا ایک امر واقعہ کا اظہار ہو گا۔

شیخ نے لکھنؤ کے دیگر اثرات بھی افسوس سے۔ دو غزلے اُن کے یہاں
 پائے جاتے ہیں۔ مگر کم۔ طویل غزلیں بھی اُن کے ہاں کافی ہیں۔ شاہِ نظیر
 کے تتبع میں ناہموار زمینیں اختیار کرتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ لکھنؤ کا اثر
 اور کیا ہو گا۔ کہ وہ اس کی ناگوار نسبت کا بھی قمع کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے
 شعر ہیں۔

ترے جوڑے کے کھٹکنے نے مراد دل۔ دستانِ باندھا
 عجب تقدیر نے عقدہ وہاں کھولا۔ یہاں باندھا
 ہنگامِ بوسہ گرم جو وہ اک ذری ہوئے
 شکرِ قحط لبِ پسینہ سے شکرِ تری ہوئے
 جھومر کا نظر سر پہ ترے اب تو چڑھا چاند
 تھا وعدہ چڑھے چاند کا لایہ۔ چڑھا چاند
 اپنے دامن میں نہ لے میرے گلِ نعتِ جگر
 جی دھڑکتا ہے کہیں چولی نہ مکے بوجھ سے

جلال سیرِ جرات اور مومن کی وقوع گوئی شیخ کی طبیعت کے موافق ہے لیکن وہ ان کا نتیجہ نہیں کرتے۔ چونکہ ان کو ہر سو خرابی کا بہت شوق ہے۔ اس لئے وہ کسی خاص کو چہ میں مقید نہیں ہونا چاہتے۔

غالب میں جرأت تھی۔ اس لئے اس نے مجمع عام میں کہہ دیا ہے

انکہ طے کردہ اس موافق را

چشنا سہ قلیل و واقف را

مگر ذوقِ اتنا بیباک شخص نہیں۔ اس کے نزدیک قلیل و واقف اور دیگر باہرین فن کا ایک ایک نقطہ حجرِ اسود کی طرح قابلِ احترام ہے۔ وہ زبان۔ بیان اور شعر گوئی کے تمام ان اصولوں کی پیروی لازمی خیال کرتے ہیں۔ جن کو اسلاف نے نہایت غور و فکر اور محنت کے ساتھ تیار کیا ہے۔ کیا اصطلاحات فن اور کیا تشبیہات و استعارات وہ ہر بات میں اس اصول کے قائل ہیں کہ

ہر زہ مشاب و پئے حادثہ شناساں بردار

اس کے در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

شیخ خرابی غریب بھی لکھتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ آورد اور تصنع ہے۔

ذوقِ عقل اور تخیل کے اصنام خیالی کے پرستار تھے۔ ان دو خوں لفظوں میں جو وسعت ہو سکے پیدا کیجئے۔ ذوق کی عقلی اور تخیلی کارپردازیوں کا دائرہ بھی کچھ کم وسیع نہیں۔ فارسی شاعری کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جو آپ کے یہاں موجود نہ ہو اور نازک خیالی کے لئے تو یہی کہ دینا کافی ہے کہ شیخ دہلی کے ناسخ ہیں۔

ذوقِ اپنے علمی ماحول کا بیدار مت و پامیر ہے۔ ان کی قابلیت اپنے عہد کی عام سطح سے زیادہ بلند نہیں۔ اور شاعروں کی مانند وہ بھی عالمگیر یا کائناتی مسائل کا مطالعہ نہیں کرتے۔ تنقید کی مدد موجودگی ان کے لئے بہت ضرر رساں ثابت ہوئی۔

ان کی ناہموار طبیعت کو یہ وہاں تنقید کی خاص طور پر ضرورت تھی۔ لیکن مذاق کو سلھانے والی تنقید کی بجائے اُس کو گمراہ کن عقاید اور اصول میسر آئے۔ جنہوں نے اُن کو قعر مصلحت میں غرق کر دیا۔ وہ اپنی ہستی مذاق سے زیادہ اپنے ماحول کی تاریکیوں کا شکار ہوئے۔

ذوق کا ماحول روشن نہ تھا۔ اس لئے وہ اس سے کوئی مفید اثرات قبول نہ کر سکے ماحول نے ان کو ہمیشہ آب و نال کی جگہ سنگ و خشت عطا کیا۔ مذہبیت و منع کی پابندی۔ توہم پرستی۔ عیش و عشرت اور ذوق عامہ۔ سب شاعروں کی بلند نظری کو پست کرنے والی باتیں ہیں۔ ذوق کا معتقدات عوام اور عامیانہ شاعری کو پسند کرنا بھی اسی اثر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

ملکی حالت نے ذوق کی شاعری پر زیادہ اثر نہیں ڈالا۔ لیکن اُن کی شاعری میں جو حزن و یاس کے چند اشعار پائے جاتے ہیں۔ غالباً اسی کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ حکیم مت انگلشیہ کے جدید نظم و نسق نے جو نئے فضا پیدا کی۔ اُس کا ذوق کی طبیعت پر زیادہ اثر نہ ہوا۔ اُن کی جمود پسندی اس قبول اثر میں مانع تھی۔ وہ بعض جدید اشیاء کو اپنے مخصوص انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر یہ کوئی بڑا اثر نہیں۔

اس زمانے میں اخلاقی حالت بہت پست ہے۔ لیکن بقول حفیظ حسن تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں کہ شاید یہیں ہو ترقتی کا زینہ اس پستی کے ساتھ بلندی بھی موجود تھی۔ ذوق میں یہ بلندی بقدر اوسط پائی جاتی ہے وہ قناعت۔ پرمیزگاری۔ وسیع النظری۔ بے تعصبی اور نیکدلی ایسے قابل تعریف اوصاف سے بہرہ ور ہے۔ بے تعصبی اور وسیع المشربی غالباً دلی کی آزاد فضا کا نتیجہ ہیں جب تمام اہل زبان میں حسن و لطافت کا احساس نہیں۔ تو ایک فرد میں ان

کی تلاش بے سود ہے۔ پنی کی بہترین افسانوی تخلیق خوجی ہے۔ اور ہیر ہینیوال۔ رابنھا۔ سوہنی وغیرہ کے خلاف مقبول عام شخصیتیں شیخ علی۔ ملا دوپازہ اور ہیر بل ہیں۔ ذوق کی دنیا حسن و لطافت سے قطعاً بیگانہ ہے۔ اُن کی طبیعت میں رنگینی کا شائبہ بھی نہیں۔ علاوہ ازیں شوخی اور طاری جوان کے ہم وطنوں سے مخصوص ہے۔ اُن میں بہت کم ہے۔ وہ کچھ طعرات رکھتے ہیں لیکن حقیقی شوخی سے نا آشنا ہیں۔ اسی لئے مرزا غالب نے کہا ہے کہ

راست گفتی لیک مے دانی کہ بنود جائے عطن

کم تر از بانگ دہل گر نغمہ چنگ من ست

ذوق میں دماغ جیسا چلبلا پن۔ اور شوخ مزاجی مطلقاً نہیں پائی جاتی۔

فتح دربار سے تعلق پیدا کر کے مفت میں بدنام ہو گئے ہیں۔ شاید دربار نے اُن کی طبیعت اور شاعری پر ٹھوڑا بہت اثر ڈالا ہو۔ لیکن اس کو اُن کی بیزار روی کا واحد سبب نہیں گردانا جاسکتا۔ نقاد حضرات دربار کے اثر کو عموماً بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ اثر اس قدر شدید نہیں کہ اس کا ناسخ اور سودا کی شاعری کے ساتھ نام لیا جائے۔ تمام بادشاہوں کے دربار ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر ایک اپنی علیحدہ فضا اور اثر رکھتا ہے۔ جس دربار کے ساتھ ذوق کا مومن وابستہ تھا۔ عام درباروں سے اس قدر مختلف تھا۔ کہ اُس سے کسی شدید اثر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

ذوق کا مرثیہ سلطنت دہلی کا آخری تاجدار تھا۔ کچھ تاریخ میں اُس کو ایک نہایت با اخلاق۔ خوش مزاج۔ رحمدل اور غریب پرور انسان ظاہر

کیا گیا ہے۔ منگڑے۔ لوہے۔ اندھے اور پاچہ اُس کے ملازم تھے۔ ہزاروں بیواؤں کی زندگی اُس کے رحم و کرم پر منحصر تھی۔ ان سب کو گھر بیٹے تھے۔

ملتی تھی۔ ظفر کی نرمی طبیعت اور بردباری کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ اُس نے ساری عمر کسی نوکر کو موقوف نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کو برا بھلا کہا۔ وہ اپنے نا اہل پیشروں کی مانند قبائے ہوش و لباس خرد سے عاری نہ تھا۔ بلکہ نہایت بیدار مغز انسان تھا۔ وہ ایک اچھا منتظم اور با رعہ بادشاہ تھا۔ وہی قلعہ جس میں اُس کے تخت نشین ہونے سے پہلے اس قدر اندوہ گردی تھی۔ اُس کے تخت نشین ہونے پر کعبہ امن دماں بن گیا۔ مجرموں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ قلعہ اوباشوں اور اٹھائی گیسروں کی کمین گاہ نہ رہا۔ اور اس میں بردہ فروشی کا بگلی السداد ہو گیا۔ متعلقین دربار کے ساتھ بھی بادشاہ کا حسن سلوک قابلِ تعریف ہے۔ وہ اُن سے نہایت خوش خلقی کے ساتھ پیش آتا۔ اُن کو ہر فقر کی نظر سے دیکھتا۔ اور اپنی بساط کے مطابق انعام و اکرام بھی عطا کرتا۔ سب درباریوں کا وظیفہ مقرر تھا۔ جو اُن کو باقاعدہ طلب کئے بغیر ملتا۔ ظفر علم تصوف میں ماہر تھا۔ ادب پرستی کا یہ عالم تھا۔ کہ اُس نے ساری نگاہیں ان کی شرح تحریر کی۔ وہ خاندانِ چشتیہ کا مرید تھا۔ اور خود بھی دوسروں کو مرید بناتا تھا۔ اسی لئے مرزا غالب نے کہا ہے کہ ۷

تیرا ہر فصل صورتِ اعجاز تیرا ہر قول معنی الہام
جانِ شادوں میں تیرے قیصرِ دم جبرِ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
ظفر کو خوشنویس میں بھی دسترس تھی۔ وہ طعنا خوب لکھتا تھا۔ چونکہ اُس کی تعلیم بہت اچھی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ شاعر ہونے کے علاوہ سخن فہم بھی تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کا دربار مرجع کماں بنا۔ اُس کے زمانہ میں شعر و شاعری کو جتنا فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان کے کسی اور بادشاہ کے زمانہ میں نہیں ہوا۔
سلجہ بادشاہ کے دربار کو عام درباروں میں شمار کرنا غلطی ہے۔ اس کو لکھنؤ کے

ادباً شاہد درباروں کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی۔ اُن میں تو علانیہ رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں۔ ہمیشہ وعشرت کی زندگی بسر ہوتی تھی۔ شراب، ناسے و سرود، عشق و محبت اور تکلفات اہل دربار بربہ تباہ کن اثر ڈالتے تھے۔ شاعری وہاں کی چر تصنع زندگی اور عادات و خصال کا اثر قبول کر کے تنزل پذیر ہو گئی۔ مگر ظفر کا دربار زاہدوں کا دربار تھا۔ اُس میں کوئی غمازش، شان و شوکت، یا رندی و ہوسا کی نہ تھی۔ اُس کا شاعروں پر بڑا اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی خطرہ تھا۔ کہ اُن کی طبیعت بھی فقیرانہ یا زاهدانہ نہ ہو جائے۔ شاعری کے لحاظ سے یہ ایک اچھا اثر نہیں۔ مگر عیش پرست درباروں کے اثر سے کہیں بہتر ہے۔ غالباً ذوق نے بادشاہ وقت کی صوفیانہ اور زاهدانہ سرشت کا حقوڑا سا اثر قبول کیا۔ اس کے متعلق بھی یقینی طور سے نہیں کہا جاسکتا۔ کہ یہ طبع زاد ہے یا کسبِ خارجی۔

ممکن ہے کہ ظفر کا مذاق جو ذوق کی شاعری پر اثر انداز ہوا ہو۔ بادشاہ کا مذاق سمجھا ہو نہ تھا۔ وہ بھی عام شاعروں کی مانند قدیم تغزل کا دلدادہ تھا۔ اور انشاء سودا اور جرات کی شاعری کو پسند کرتا تھا۔ چونکہ شیخ کو بعض اوقات کے حسبِ فرمایش غزلیں تیار کرنی پڑتی تھیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ وہ کثرتِ مطالعہ اور تتبع کی وجہ سے ان شاعروں کے طرز کے دلدادہ ہو گئے ہو۔ لیکن تحقیق سے کام لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس لحاظ سے بھی ذوق نے بادشاہ کا بہت کم اثر قبول کیا۔ اس رہا میں غالب کو مستثنیٰ کرتے ہوئے تمام شعرا کا میلان طبیعت و ذوق عامہ کی طرف تھا۔ اس لئے بادشاہ کے مذاق کو اُن سے علیحدہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگر اُس کا مذاق عوام سے مختلف ہوتا تو اس کا ذوق کی شاعری پر اثر انداز ہونا کچھ معنی رکھتا ہے۔ مگر بادشاہ تو خود عام شاعروں میں سے تھا۔ اس لئے شیخ کا اُس کے مذاق سے اثر پذیر ہونا بارانِ درآبِ ست کا مضمون ہے۔ ذوق کے خود رو میلانا

کو ظفر کے ساتھ منسوب کرنے میں تعمیل نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی شاعر کی دربار میں رسائی نہیں ہوئی تھی۔ کہ وہ سوڈا کی غزل پر غزل کہتا تھا۔ اہل نظر کے لئے یہ بات بصیرت سے خالی نہیں۔ علاوہ انہیں ہم یہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کہ ذوق کو آئے دن ظفر کی فرمائشیں پوری کرنی پڑتی تھیں۔ اصلاح کی اور بات ہے، لیکن تجویس بنا کر بادشاہ کو سوئپ دینا آزاد کے لاتعداد افسانوں میں سے ایک ہے۔ ہم جتنا ظفر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذوق نے اس کے چار دیوانوں میں سے ایک مصرع بھی نہیں لکھا۔ اس کی زبان لب و لہجہ خیالات اور ذہنیت ذوق۔ جسے اس قدر مختلف ہیں۔ کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود ظفر کے انداز میں غزل نہیں کہہ سکتا۔

دربار سے تعلق خود داری کے احساس کو زائل کر دیتا ہے۔ انسان عزت نفس کو چھوڑ کر بندہ ہو س بن جاتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہی فکر رہتی ہے۔ کہ کوئی ایسی بات کرے۔ جس میں بادشاہ کی خوشنودی ہو، اور وہ اس پر انعام و اکرام کی بارش کرے۔ رومانیت اور اخلاق پر مادیت اور سفلی غالب آجاتے ہیں۔ طبیعت میں شرافت کی جگہ دنائت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی فطرت پرست ہو کر لجاجت اور خوشامد کی خوگر ہو جاتی ہے۔ شیخ ایک امیر گھرانے کا چشم و چراغ نہ تھا۔ اس لئے دربار کے تعلق نے اس میں سفلی ضرور پیدا کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دل میں رشک و حسد کی آگ شعلہ زن رہی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کہ اس کے مقابلہ میں دوسرے شاعر میدان میں آئیں۔ اس نے ان پر جادو بجا سفیانہ حملے کئے۔ یہاں تک کہ وہ اس کا جواب دینے پر مجبور ہو گئے۔ قصاید میں شیخ نے بلند مضمون نہیں پیدا کئے۔ بلکہ اکثر مطمح اور اس کے لادینہی کا تذکرہ کیا ہے۔ بعض نقاد کہتے ہیں۔ کہ ہوس زر کی وجہ سے ذوق کی توجہ بلند پایہ شاعری

سے ہٹ گئی۔ وہ قصاید کو زیادہ زور دار اور مبالغہ آمیز بنانے کی فکر میں مجبور ہوا۔ اس طرح اُن کی طبیعت پر مبالغہ، تصنع اور تخیل بیش از بیش متصرف ہو سکتے گئے۔ انہوں نے اپنے ذہن کو مضامین غالبہ سوچنے کی تکلیف نہ دی۔ اور نہ اپنے باطنی احساسات پر نظر رکھ سکے چونکہ اُن کو معاش کی فکر نہ تھی۔ اور دنیا کی تکلیفات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے اُن کے جذبات میں عمق اور طبیعت میں وسعت نہ پیدا ہو سکی۔ اُن کا تخیل خویوں سے ہٹ کر برائیوں کی طرف مایل ہو گیا۔ وہ داخلی خصوصیتوں کی جگہ ظاہری خصوصیتوں پر فریفتہ ہو گئے۔ شاید درباری زندگی اس صفت سے ذوق کی طبیعت پر اثر انداز ہوئی ہو۔ لیکن اس اثر کو تمام متردباری تعلق کا نتیجہ قرار دینا شاید درست نہ ہو۔ ذوق کی اپنی طبیعت نازک خیالی۔ عامیانہ شاعری۔ مبالغہ اور تصنع کی طرف اس قدر مائل ہے کہ اُن کے ذاتی رجحانات اور التساب فارحی کو علیحدہ کرنا نہایت دشوار ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ذوق نے قصیدہ میں جو کچھ کہا۔ اُن کی اپنی کثرت فکر کا حاصل تھا۔ اور درباری تعلق اُن میں دخل انداز نہ ہوا۔ کیا غالب نے سینکڑوں امیروں اور فرماں رواؤں کی مداحی نہیں کی؟ کیا اُن کا دربار کے ساتھ کچھ کم تعلق تھا جو لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ آپ کا دربار کے ساتھ تعلق ذوق سے بہت کم ہے۔ آپ کے حالات زندگی کا غور سے مطالعہ فرمائیے۔ اور دیکھیں کہ غالب کو ظفر کی مدح و ستایش کی ذوق سے کم ضرورت نہ تھی۔ لیکن مرزا کے قصاید میں منانت اور شہنشاہی کا پہلو ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ وہ بھڑک رہی خوشامد سے کام نہیں لیتے اُن کے مضامین ناگوار طور پر مبالغہ آمیز نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ذوق کی طبیعت شروع سے فارحی شاعری کی طرف مایل تھی۔ اگر بقرض محال اُن کی شاعری کا تصنع تمام متردبار کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ تو اُن کے دیوان میں کوئی نہ کوئی

ایسی غزل ضرور ہونی چاہیئے۔ جو ان اثرات سے پہلے لکھی گئی ہو۔ اور تکلفات سے مبری ہو۔ ذوق کے دیوان میں ایسی ایک غزل بھی نہیں پائی جاتی۔ ہمارے خیال میں شیخ پر دربار کے تعلق کا زیادہ سے زیادہ یہی اثر ہوا کہ وہ پہلے کی نسبت زیادہ ظاہر ہرست بن گئے۔ ایک نفاذ کو شبہ گذر سکتا ہے کہ ذوق کی غزلیات میں جو تخیل پائی جاتی ہے۔ بڑی حد تک ان کی قصیدہ گوئی کا نتیجہ ہے۔ ذوق کی پہلی غزل۔ رکھتا بہر قدم ہے وہ یہ ہوش نقش پا، غیر معمولی تخیل کے اعتبار سے ایک خاصہ قصیدہ ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ دربار کے آنے والے اثرات نے پہلے ہی ذوق کی طبیعت پر سایہ ڈال دیا؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ دربار نے شاعر کی طبیعت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ ممکن ہے کہ ان کی تمام میرا بہرہ روی درباری تعلق ہی کا نتیجہ ہو۔ لیکن درباری زندگی کے روایتی اثرات کو سامنے رکھ کر بلا سوجھے نتائج اخذ کرنا انتقادی کم نگاہی ہے۔

دربار کے ایک اثر کی نسبت ہم کسی قدر قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ذوق نے اس کو ضرور قبول کیا۔ چونکہ آپ کو استادشہ کی حیثیت سے اپنا وقار قائم رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ (اس لئے وہ مجبور تھے۔ کہ اپنے آپ کو قادر الکلام ثابت کریں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ دیگر شعرا سے گوتے بمقتلے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ ہر طرز میں شعر کہنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر اپنی شاعرانہ استعداد کی نمائش کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ اپنی شاعری کو ہر لحاظ سے جامع بنا کر عام و خاص سے داد تحسین کے جویا ہیں۔ شیخ نے ذوق عامہ کا اتباع کیا۔ تاکہ ان کو قبول عام حاصل ہو اور دنیا ان کو نہ صرف بادشاہ کا استاد نسیم کرے۔ بلکہ ایک مسلم الشیبت استاد بھی قرار دے۔ یہ ایک ایسی بات ہے۔ جو غالباً ذوق کی شاعری پر اثر انداز ہوئی۔ انہوں نے اپنے

جذبات کی ترجمانی کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ رائج الوقت مقبول عام دھنوں میں
نغمہ سرائی کر کے نام پیدا کیا۔ اگر یہ جامعیت کا شوق بھی اُن کی اپنی طبیعت کا نتیجہ
قرار دیا جائے۔ تو ذوق کی شاعری پر دربار کے اثر کا نظریہ قطعاً بے اصل و بے بنیاد
ثابت ہوتا ہے۔ *

شہری تہذیب کے اثر کو بھی ناقدانہ توجہوں کے لئے احتیاط کے ساتھ
استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ شہری تہذیب جو اس مدرک کو کند کر دیتی
ہے۔ دیہات نے لیگ آزاد فضا میں رہنے کے سبب تازگی نظر سے بہرہ مند
ہوتے ہیں۔ شہر کی محدود فضا قدرت کے آزادانہ سیر و مطالعہ کی اجازت
نہیں دیتی۔ یہ انسان کی پرواز خیال کا دائرہ محدود کر دیتی ہے۔ ذوق کو
ایک طرف عوام کے مذاق اور خیالات نے اپنے رنگ میں مصطبغ دیا۔
دوسری طرف دربار کی محدود فضا نے اپنے دام میں امیر کیا۔ اس وجہ سے
اُن کی شاعری اور فن عالمگیر نہ بن سکے۔ اُن کی شاعری مقامی شاعری بن کر رہ
گئی۔ اور دیگر مقامات میں مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ *



پوٹھا باب

وجدان - ملکات اور شخصیت

وجدان اور ملکات | غالب کی مانند ذوق بھی ایک سپاہی کے گھریلا ہوئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساقی فطرت کو شیخ سے کچھ خصوصیت تھی۔ اُس نے سپہگری کا بادِ مُردا فگن مرزا کو عنایت کیا اور مُردان کے جام میں ڈال دی۔ شیخ کی طبیعت تہو را اور وقار سے نا آشنا ہے۔ اُن کے آبا و اجداد ہندوستان کی خاک سے اُٹھے اور اُسی میں مدفون ہوئے۔ ملک کی آب و ہوا کے اثرات اُن کے رُگ دے میں طاری و ساری ہو کر ذوق کی طبیعت میں متواتر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی طبیعت عالم ہندی ہے۔ آپ کی شخصیت اُن عادات اور خصایل سے مرکب ہے۔ جن کو ہم آج بھی ہندوؤں کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

آب و ہوا کا اثر اقوام کی طبیعت پر مسلم ہے۔ کوئی عیش و عشرت کی متلاشی ہے۔ تو کوئی غور و فکر کی دلدادہ۔ ایک غفلت شعار ہے۔ تو دوسری ترقی پسند ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ جو قوم اُس میں آباد ہوئی۔ تھوڑے سے عرصہ میں اپنی طاقت اور ترقی کے جوہر کھو بیٹھی۔ دیگر گرم سیر ملکوں کی طرح اُس کے باشندے بھی سکون و جمود کی طرف

مابین ہیں۔ اس کے فراخ میدان۔ طویل سلسلہ کہسار۔ پر عظمت دریا اور وسیع و عریض جنگلات۔ انسان کو اس قدر مرغوب کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت کو ناتواں اور زندگی کو ناپائیدار خیال کرنے لگ جاتا ہے۔ مردانگی کی جگہ نسائیت۔ تند خوئی کی جگہ عجز و تذلل۔ اور عمل کی جگہ تفکر پیدا ہوتے ہیں۔ ہندو کی طبیعت میں یہ خصوصیات مستقلاً سرایت کر چکی ہیں۔ ان کی طبیعت میں نرم مزاجی اور انکساری اس قدر شدت سے پائے جاتے ہیں۔ کہ یہ بجائے خود قابل اصلاح قومی نقائص بن گئے ہیں۔ تفکر ہندو نظر پر حیات کا ایک لازمی جزو ہے۔ جس طرح زمانہ قدیم میں ہندوستان کو خیالی فلسفہ پر ناز تھا۔ اُسی طرح اب بھی ہے۔ ان کی نسائیت کسی توضیح و تشریح کی محتاج نہیں۔ کیونکہ یہ ہندوؤں کے خیالات اور گفتار و کردار ہر بات سے مترشح ہے ان کے احساس جمال پر نظر ڈالئے۔ یہ ہلات خود یک ابھی خصوصیت ہے۔ مگر اس کی عموماً تہذیب کی نشانی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کا تخیل پُر شوکت نہیں۔ ان میں تخیل کی ہمہ گیر قوت کی بجائے تخیل پائی جاتی ہے۔ جس کو تخیل کی ایک کمزور صورت خیال کرنا چاہیے۔ ہندو آرٹ میں علی العموم سادگی اور عظمت جیسی اہم خصوصیتوں کا فقدان ہے۔ اس کا سبب ان کی تخیل سے دبستگی ہے۔ جو آرائش کو پسند کرتی ہے۔ اور سادگی و صفائی سے نامانوس ہے۔ تخیل فطرتاً سادگی۔ تحمل اور وقار کی طرف مائل ہے۔ تخیل کا میلان ریزہ کاری۔ نکتہ پردازی۔ ادنیٰ امور اور رقیق حسیات کی طرف ہے۔

یہ سطور مذہبی تعصبات سے خالی الذہن ہو کر لکھی گئی ہیں۔ اور ان کو اسی نظر سے پڑھنے کی بات کی جاتی ہے۔ Sentiments

ہندوؤں کی عمارات کو دیکھئے۔ ان میں کس قدر بھڑک اور مربع کاری دم لے رہی ہے۔ ہر طرف آرائش ہی آرائش نظر آتی ہے۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر ہمیں یہ احساس ہوتا کہ ہم انحراف اور تاج محل کی مانند ایک واحد اور مکمل تعمیر نہیں دیکھ رہے۔ ہر ایک کام اس قدر زیادہ ہے۔ کہ نظران کی پرکاری ہی میں کھو جاتی ہے۔ جس طرح پر نضیع شعروں میں ذہن صنایع و بدایع کی طرف متوجہ ہو کر مضمون سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور وحدت کی جگہ انتشار محسوس کرتا ہے اسی طرح ہم ہندو تعمیرات کی متفرق خوبیوں میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ ان کی تعمیری وحدت نگاہوں سے مستور ہو جاتی ہے +

اجتہاد کے غار اور تاج محل دونوں عجائبات ہند میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر اجتہاد کے فارحیرت انگیز آرائشوں کے باوجود تاج محل کے مقابلے میں اس قدر غیر معروف کیوں ہیں؟ شاید اس میں عشق کی عالم فریب ریلیزیوں کو بھی دخل ہو۔ لیکن کوئی صاحب نظر اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ تاج کی سادگی اور عظمت کے سامنے دنیا بھر کی صنعتیں بے کار ہیں۔ تنخیمل ادنیٰ اثر پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اور معمولی باتوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ جو ایک انسانی خصوصیت ہے۔ صنایع نازک کا تعلق تمام تر زندگی کے عملی پہلو یعنی معمولاتِ خانہ داری کے ساتھ ہے۔ اس لئے ان کی دلچسپیاں اور مرغوبات صنایعِ فاضل سے بہت مختلف ہیں۔ نیوانی طبیعت فلسفہ کی دماغ سازی سے منفرد ہے۔ اور زندگی کی عام اشیاء کے ساتھ انس رکھتی ہے +

علاوہ ازیں ہندی طبیعت کی نسائیت ان رقیق سیات میں جلوہ گر ہے جن کو ہم نازک جذبات یا جذباتِ رذیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ جذبات شدید عجز و انکسار اور نرم مزاجی کے شاخ و برگ ہیں۔ حقیقی شعرا کے جذبات

کا نظر غائر سے مطالعہ کیا جائے۔ تو ہم اُن میں ایک گونہ ثقافت محسوس کریں گے۔ اُن کا لہجہ ہر حالت میں زوردار ہوگا۔ مثال کے طور پر اقبال کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

کس کو ہوگا اب وطن میں آہ! میرا انتظار؟ کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار؟
 خاک مرقد پر تری سیکر بہ فریاد آؤں گا اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟
 عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
 میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو پہل بسی

یہ ایک چابکدہ اندیشہ شاعر کے پُر اثر جذبات ہیں۔ اس کے برخلاف کوہر کی مشہور نظم دہاں کی تصویر دیکھ کر، یا حفیظ جالندہری کی نظم والدہ کی موت، ملاحظہ ہو اقبال کی نظم مجمع نشو و جذبات ہے۔ اُس سے دوسرے شاعروں کی نظمیں معری ہیں حفیظ کی نظم میں تو ہر سکا والدہ کو طنز پر لہجہ میں خطاب کیا گیا ہے۔ اُس کے اشعار میں رقت نہیں۔ وہ اوپر سے دل سے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن سے زندگی کا احساس نہیں ہوتا۔ شاعر نے ساز سخن کے نازوں کو اس طرح چھڑا ہے کہ اُن کی آواز میں گونج نہیں پیدا ہوتی۔ اس ناتواں صدا سے ہمارے سازِ دل کے تار بیدار نہیں ہوتے۔ شوقِ قدوائی کی مشہور نظم 'عالم خبیال' اسی وجہ سے ناکام ہے کہ اُس کے لہجہ میں وہ اُلٹھان۔ وہ لطافت نہیں جس نے میر حسن کی ثنوی کی مشہور بنا دیا۔ دونوں شاعروں نے رلانے والے جذبات کو نظم کیا ہے۔ مگر رلانے کے لئے پُر سوز لہجہ درکار ہے۔ جو شوق کے ہماں مفقود ہے۔ اُس کا لہجہ عام نیوانی لہجہ ہے۔ جو شاعری کے لئے قطعاً غیر موزون ہے۔ اب وہوا کے اثر نے ہندوؤں میں بھی یہی خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ اُن کا طرزِ عبادت۔ عقائد اور عادات و خصائص ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بالطبع حاکم

ہیں۔ لیکن یہ احساس اُن کو تندرست مردانہ جذبات کی طرف نہیں لے جاتا۔ بلکہ نسبت کی طرف مائل کرتا ہے۔ ہندوؤں میں کپیر اور نائک کی روح بدستور کار فرما ہے۔ فنا کا احساس۔ خدا پرستی۔ معرفت کا ذوق۔ توکل اور قناعت۔ دنیا سے کنٹھشی۔ خدمتِ خلق کا جذبہ۔ اور عجز و انکسار آج بھی اُن کی طبیعت کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ ذوق نے اُن کو بلا وجہ ہندوئے خدا ترس نہیں قرار دیا۔

شیخ کی طبیعت اُن تمام خصوصیتوں سے بہرہ مند ہے۔ جس طرح سانِ العصر کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ اُبکر فلسفہ ہے اور فلسفہ اُبکر۔ اُسی طرح شیخ مرحوم کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ کہ ذوقِ تخیل ہے اور تخیلِ ذوق۔ اُن کا تقریباً ہر شعر تخیلِ محض پر مشتمل ہے۔ وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہیں۔ کہ نکتہ پردازوں اور روشنائیوں سے کام لیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ غزل کے مقابلہ میں اُن کی طبیعت قصیدہ میں زیادہ لگتی ہے۔ اس صنف میں وہ آزاد اور بے پروا ہو کر جو بات ذہن میں آئے۔ روئے قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ اُن کے قصائد کی امتیازی خصوصیت بیان کرنی ہو تو بلا تامل کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ نازک خیالیوں کا ایک بے پایاں دفتر ہیں۔ غزل کی بھی قریب قریب وہی حالت ہے۔ اس کو بھی ایک قسم کا قصیدہ خیال کرنا چاہیئے۔ جس میں شاعر زیادہ تر محبوب کی مداحی کرتا ہے۔ اور کبھی بھی گریز کے طور پر اپنی شاعری اور عظمت کے متعلق فخریہ شعر کہہ جاتا ہے۔ یعنی سراسر تخیل ہونے کے اعتبار سے ذوق کی غزلیات کو قصیدہ طور پر کہنا چاہیئے آپ فرماتے ہیں کہ

کیڑا ذرا سا اور وہ ہتھر میں گھر کرے انسان وہ کیا نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے
ہم خوب ہیں واقف ترے اندازِ کرے یہ تار نکلتا ہے کہیں دل کے گھر سے
کھاؤں میں بیڑ جو اُس بن کیونکہ دل ٹکڑے نہ ہو
جو رگ پاں ہے وہ مجھ کو شیر کا سا بال ہے

دنبالے پر جو سرے کے دانہ ہے خال کا
گویا کہ دستِ چشمِ فسون گز میں ماش ہے

اڑاے خوب گلچھڑے نکل مجنوں نے زنداں سے
کہ ہر سو گلِ فشاخی ہے شرارِ سنگِ طفلان سے
شرارے منتقل نکلے یہاں تک سنگِ طفلان سے
کہ چمکے ہے سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ باران سے
باندھ دے نائقے کی گردن میں دلِ نالانِ قیس
بوجھ اس کا کم ہے اے سیلی جرس کے بوجھ سے
حاضر میں مرے تو سن وحشت کے جلو میں
باندھے ہوئے کہار بھی دامن کو کمر سے
میرے دودِ آہ سے یاں تک زمانہ ہے سیاہ
آفتابِ آسماں زنگی کے منہ کا خال ہے

فراقی غلام میں گندم ہے سینہ چاک اب تک الہی ہونہ وطن سے کوئی غریب جدا
توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے شرکی دنیا میں گرا نباری اولاد غضب ہے
پہلی قسم کے شعروں کو پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ معنی کے لحاظ سے بالکل آشنائے ہیں۔ چند
خیال ہیں۔ جن کو نظم کر دیا گیا ہے۔ سورہ ان میں کوئی معنویت نہیں اس قسم کے بعض اشعار
میں کی بات کی کوئی خاص جڑ بتائی جاتی ہے۔ ذوق کا دیوان اس قسم کی شاعرانہ مگر بے کیف
توجہوں سے بھر پڑا ہے۔ دوسری قسم کے اشعار میں تصویریں محض ہے ان
میں پہلی قسم کے شعروں سے بھی کم معنویت کا خیال رکھا گیا ہے تیسری قسم
میں اس کو اصطلاح میں حسنِ تعبیل کہتے ہیں۔

کے اشعار میں زندگی کے مشاہدات کو تخیل کا رنگ دے کر معانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذوق اپنے استاد ناسخ کی مانند کوہ کند کاہ بر آوردن کی انتہائی ہستیوں کی سر نہیں کرتے۔ لیکن اس سے کسی حیثیت سے کم بھی نہیں۔ اسی لئے وہ فرماتے ہیں کہ

نازک خیالیاں مری توڑیں عدد کا دل

میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پھر کو توڑ دوں

ذوق کی نازک خیالیاں اپنی منزل آپ ہیں۔ یہ محض خیالات ہیں جو ہمیں کسی خاص معنی یا مضمون تک نہیں پہنچاتے۔ شیخ کی صناعتی بے مقصد صناعتی ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ ان کی نظر بعض اوقات نرالی تشبیہات اور نکات پر جا پڑتی ہے لیکن جو حکم تخیل ایک ادنیٰ قوت ہے اور شاعر بلند مذاقی نہیں اس لئے وہ اپنے خیالات کو پُر لطف نہیں بنا سکتا

کوئی دم شمع مردہ میں بھی ہے باقی دھنواں ہوتا

ناخن سے تیسز تر مجھے ہر برگ گل ہوا

شمع ہے اک سوزنِ گم کشتہ اس کا شانے میں

مے کھج ایک پروانے کا کیا اپنے چراغاں میں

تارا ساتھ پہ ہوؤں میں کنوئیں کے رنگ آب

طوف گرداب صفت چاہئے اپنا ہم کو

محراب طاق کماں بن جائے دستہ زر گس تر کش ہو

انہی مشاہدات کو کوئی اچھا شاعر استعمال کرے۔ تو خاصے شعر نکال سکتا

ہے۔ ذوق کی نظر ادنیٰ مشاہدات اور تخیلی مضمونوں کی طرف جاتی ہے۔

اس لئے ان کے اشعار ہمیشہ بے مزہ ہوتے ہیں۔ پہلے مصرع کے مشاہدہ

کو غالب نے بھی استعمال کیا ہے۔ لیکن اس نفاست سے کہ شعر کچھ کا کچھ بن گیا ہے۔
 شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھنوں اُٹھتا ہے
 شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
 ذوق کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سمجھ یہ دار و رسن تار و سوزن لے منہ بول کہ چاک بردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے
 عمر طے کرتی ہے ہر دم سفر بحر فنا جس کو تو سانس کہے ہے دل معزوں چلتی
 چلتا گود دیکھے ہے ساحل کو سوار کش
 پر حقیقت میں ہے کشتی سرجھوں چلتی

ان سب شعروں کا مضمون اچھا ہے۔ لیکن چونکہ شاعر کا دھان لہنی کی بجائے تخیل کی
 طرف ہے۔ اس لئے وہ دار و رسن، تار و سوزن، چاک بردہ، اور رفو کے تلازش
 میں محو ہو جاتا ہے۔ جو قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ اور مضمون کو
 اپنا اثر نہیں پیدا کرنے دیتے۔ اگلے دو شعروں کی بندش کا انحصار لفظ چلتی پر ہے
 جس کو تین بار استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر لفظوں کے ساتھ
 کھیل رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ شبہ بھی گزرتا ہے۔ کہ وہ عمر کے طے ہونے کا مضمون
 قلمبند نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ دکھانا چاہتا ہے۔ کہ اُس نے کشتی میں بیٹھ کر ساحل کو دیکھا
 ہے۔ یہ صدق بیان کے اصول کے خلاف ہے۔ اس لئے شاعر قاری پر اثر ڈالنے
 میں کامیاب ثابت نہیں ہوتا۔

اگر تخیل شگفتہ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن ذوق کی تخیل ہمیشہ
 بے کیف ہوتی ہے۔

جم جائے فاک وحشی چشم بتاں پہ گھاس
 لیکن ہرن گھڑی نہ ہوئے بن ہری ہوئے

موتے سہارا ان سید کا ایک سر اسر شکر ہے
 مانگ جو ہے اک مار سفید اس شکر کا سر شکر ہے
 قبر میں عاشق جو تیرا مضطرب احوال ہے
 بوج تربت پر بھی لکھا سورۃ زلزلا ہے

ذوق کی شاعری میں تخلیق اس قدر ہے کہ اس کے لئے تنقید کی ضروری
 کی ضرورت نہیں۔ ہر قاری اس کو خود محسوس کر سکتا ہے۔ ذوق کے تخلیق کی
 ناری بھی انہی تخلیقی رجحانات سے ظاہر ہے۔ ان کی نظر اعلیٰ تر اکیب۔ استعارات
 تشبیہات۔ تصورات اور خیالات کی طرف نہیں جاتی۔ غالب کا شعر ہے یہ

کا دکا و سخت جانی مائے تنہائی نہ پوچھ
 صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

تنہائی فراق کی شرت اور شب بچراں کو بعد شکل سحر کرنا ایک غیر محسوس
 خیال ہے۔ غالب نے اس کو مصوّر بنا دیا ہے دکا و کا و سخت جانی اور
 فریاد کے بیتوں کو کاٹ کر جوئے شیر لانے کی طرف تلخ کر کے آپ نے ہمارے
 سامنے ایک پہاڑ کا تصور پیدا کر دیا ہے۔ ادیبوں بھی محاورہ ہے۔ کہ دن یارا
 پہاڑ ہو گئے ہیں۔ ان سب باتوں نے مل جل کر تنہائی فراق کی ناقابل اظہار
 کیفیت کی زندہ تصویر پیش کر دی ہے۔ اور یہ کمال فن ہے۔

اسی طرح غالب نے ذیل کے اشعار میں بھی اچھوتے تصورات پیش
 کئے ہیں۔

خاق ہے صفحہ عبرت سے سبق ناخواندہ در نہ ہے چرخ وزیں یکہ رقی گردانہ
 اصل امت نہ دیکھا جز شکست آرزو بن بد دل پیوستہ گویا یک لب اسوس ہے
 یہ آئینہ غار کا وہ نقشہ تیسے جلو سے نے کرے جو پر تو خورشید۔ عالم شہنشاں کا

بدعا محو تماشا شاعری شکستِ دل ہے
آنند خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

ان اشعار میں اچھوتی تشبیہات بھی موجود ہیں۔ اس لئے ان کی زیادہ مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ تراکیب کے لئے فکرِ سا ضروری ہے۔ شرابِ آتش بیک مزہ جا عمر کاہ شرابِ دیدار، بگدستہ بند رنگینی، لفظِ شعلہ درو، آتشکدہ راز، صیدِ گمستہ دم اندازِ سرائی، خاطرِ آشوب گل، رازِ نامہ اندوہ، دیرِ مست، سنگیں خار، شرابِ گل دیا سیمین، گرسنہ چٹیم اثر، وغیرہ ایسی ترکیبیں ہیں۔ جن تک صاحبِ تخیل شعرا کے سوا اور کسی کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ ان میں سے اکثر لطیف استعارات پر مشتمل ہیں مثلاً شرابِ آتش، آتشکدہ راز، یک مزہ جا۔ اسی طرح آہ کی پرافشانی، رگ اندیشہ، زکوۃ حسن زنجیرِ سوائی، جنائے پائے خزاں، دودِ چراغ کا تریاکی، ابرہہ ہمار کا حکمدہ، نشاطِ دل کی بساط، بھٹی، شیشی، نبضِ خس اور غلوتِ ناموس۔ ایسے استعارات ہیں۔ جو ایک نہایت بلند تخیل کا پتہ دیتے ہیں :

تخیلِ اسلوبِ بیان کو بھی لطیف بنانا ہے۔ مضامین تک عام شاعروں کی رسائی مشکل نہیں۔ لیکن اعلیٰ اسلوب ہر شاعر سے بن نہیں آتا۔ ایک بلند پایہ شاعر ہی اس کو خوبصورتی سے ادا کر سکتا ہے۔ لیکن ادنیٰ شاعر ہمیشہ رائے سے اسلوب اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا ذہن عمدہ طرزِ بیان تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلند پایہ شاعروں کا تخیل مضمون کے لئے بہترین اندازِ عمیق غور و فکر کے بغیر تلاش کر لیتا ہے۔ مرزا غالب ایک مضمون کو یوں ادا فرماتے ہیں کہ

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے

مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑ دیرہمن کو

اور ایک اور شعر میں دوبارہ اس مضمون کو یوں قلمبند فرماتے ہیں :

نہیں کچھ سجدہ و زنا رکے پھندے میں گِرائی
 وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
 ایک کم پایہ شاعر کا اسلوب اس شعر سے آشکارا ہے کہ
 ہے رہنمائے خلق عمل جس کے نیک ہوں
 کا فر ہو وہ عقیدہ میں یا کہ ہو دین رار
 ظاہر ہے کہ غالب کے اشعار کے سامنے اس شعر کی کوئی حقیقت نہیں۔
 غالب کا ایک اور شعر ہے

رونی ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
 انجمن بے شمع ہے گر برق خرمین میں نہیں
 اسی مضمون کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیے اور غالب کے شعر سے موازنہ کیجئے۔
 سرکٹ کے سرفراز ہیں ہم اور زیادہ جوں شاخ بڑھے۔ ہو کے قلم۔ او زیادہ
 ہو کے ہمال وہ پھر بڑھتے ہیں دانوں کی طرح کب فنا ہوتے ہیں دنیا میں محبت والے
 ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ شاعر کا تخیل کس طرح مضامین کو ادا کرنے کے
 لئے اعلیٰ اسلوب سے تلاش کرتا ہے۔ شیخ کی نظر معمولی باتوں میں اس قدر محو
 رہتی ہے کہ وہ عمدہ تشبیہات۔ تراکیب اور استعارات کا تصور نہیں کر سکتے۔
 ان کی تخیل رشتہ پیچیدہ کی طرح اپنے آپ ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔
 اور تخیل کی مانند مکان و لامکان کو اپنے حلقہ دام میں نہیں لاتی ماسلوب بیان

مثلاً اسلوب بیان کا مواد نہ کرنے کے لئے ذوق اور غالب کے یہ شعر ملاحظہ ہوں
 شبیب مادی ذوق سینے میں ہوئی ہیں حریف لکھیں میری جو آہ ہے گویا وہ ہے اک نخل ماتم کا
 خوشی میں نہاں خوش گشت لاکھ آرزوئیں ہیں چراغِ مردہ ہوں میں بیسراں گوبر غنہاں کا

کی پوچھے۔ تو وہ بھی اس قدر معمولی ہوتا ہے۔ کہ ہر انسان اُن کا آسانی سے جواب دے سکتا ہے۔ وہ نفی، تلامذات اور خیالی باتوں میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ اسلوب بیان نہایت ناقص ہو جاتا ہے *

آزاد مرحوم نے ۲ سبحات میں لکھا ہے کہ شیخ نے عمر بھر اپنے ہاتھ سے کوئی جانور فوج نہیں کیا۔ عالم جوانی کا ذکر کرتے تھے۔ کہ یاروں میں ایک مجرب نسخہ قوت باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا۔ شریک ہو کر اس کے بنانے کی صلاح پھڑی ایک ایک جز کا ہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمہ ہوا چنانچہ چالیس چڑوں کا مغز ہمارے سر ہوا۔ ہم نے گھر آکر اُن کو پکڑنے کے سامان پھیلا دئے۔ اور نین چڑے پکڑ کر ایک پیچھے میں ڈالے۔ اُن کو پھڑکتے دیکھ کر خیال آیا۔ کہ ان بیگناہوں کو مارنا انسانیت سے بعید ہے۔ آخر خدا کو منہ دکھانا ہے یہ کہنا اور اُن کو مارنا کر دیا۔ مکر فرماتے ہیں کہ شیخ کو ٹہلنے کی عادت بہت تھی۔ دروازہ کے آگے ایک لمبی گلی تھی۔ اکثر اُس میں پھرا کرتے تھے۔ ایک دن رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ابھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ اُس وقت حافظ غلام رسول دیران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اسے مارا کیوں نہیں؟ کئی آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا۔ مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے۔ کچھ کے رکعت ثواب ہو گا؟ یہ روایتیں ذوق کی نسوانی سرشت پر دلالت کرتی ہیں۔ زن سے ظاہر ہے کہ

وہ ہندوں جیسی نرم اور بے آزار طبیعت رکھتے ہیں۔ اُن کو ایذا دہی اور

سے مؤلف حیاتِ ذوق ہمارے نظریہ کا موید ہے۔ وہ اس قسم کے چند اور واقعات بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے۔ کہ حقیقت میں شیخ صاحب کی رحمہ علیہ اعتدال سے متجاوز تھی۔ رحمہ علیہ بیشک ایک اعلیٰ صفت ہے۔ مگر اس قدر کہ موذی کو قبل از ہذا ہلاک دیکھا جائے

جفاکاری سے نفرت ہے۔ شیخ کا دل اس قدر نازک ہے کہ آپ کی دردمندی
 رحم کی حد سے گذر کر شدید سوانحیت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ جوش - ہمت -
 جرات - دلولہ اور ثقہ جذبات سے نا آشنا ہیں۔ اُن کی طبعی ملائمت اور
 شدید نسائیت نے اُن کو اسلام کی حلقہ بگوشی سے نکال کر بیحد اور عین مت
 کا پیرو بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں ہمیں مضمحل جذبات کا ایک
 تالطم دکھائی دیتا ہے۔ تخیل کے بعد یہی نسوانی حسیات اُن کی شاعری کا
 طرۂ امتیاز ہیں۔ وہ تلقین اور لجاجت جو ہمیں قصائد میں مبالغہ آمیز مضامین
 بن کر نظر آتے ہیں۔ تغزل میں نحیف و سبک جذبات کا گرو و غبار بن گئے ہیں
 مثلاً

کس نزاکت سے ہو دیکھو اتحاد حسن و عشق زلف اہل شانے میں کھینچے دوہی ہاں شانے میں
 پاک لکھ اپنی زباں ذکر خیر اے پاک سے کم نہیں تیری زباں منہ میں ترے مسواک سے
 نزع میں بھی تیری کو تیرا ہی ہے بس انظار جانبِ نر دیکھ لے سے ہوش جب آجائے نئے
 چھکے ہے میر سلیم ماہ نو پر وہ
 غرورِ حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں

قی

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں سے دیہر اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو چھا
 ڈھل جائے جو بھی اسی طرح کروں شام اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا
 جب کل ہو پھر وہ کہوں پھر کل کی طرح سے گر آج کا دن یوں ہی گزر جائے تو اچھا
 القصہ نہیں چاہتا۔ وہ جائے یہاں سے
 دل اُس کا نہیں گر چہ اہل جائے تو اچھا
 ان شعراء سے ظاہر ہے کہ ذوق کے جذبات کس قدر سبک اور ضعیف

ہیں۔ مذہب۔ نصیحتگری۔ اخلاق۔ خیالات۔ عشق و محبت۔ مزاج ہر طبیعت سے اُن کی طبیعت سنوائی ہے۔ اُن کے عاشقانہ اشعار کی نوعیت آپ دیکھ چکے۔ اخلاق اور مذہب کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا بل بنا۔ چاہ بنا۔ مسجد و تالاب بنا
دل عبادت کے چرانا اور اجرت کی طلب کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب؟
زیادہ ہو گا تو دل سے بھی کہیں روزہ کہ اس میں آیا تو روزی ہے اور نہیں روزہ
نہ چھوڑ تو کس عالم میں راستی کہ یہ شے عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جوان کیلئے
اے اکیس گراں کشتِ فحوش میں نہ لوں ہرگز مرے مذہب میں تم کو نہ ہی کشتہ کرنا پائے گا
بڑے مونی کو مارا نفس مارہ کو گر مارا ہنگامہ و شیر زمارا تو کیا مارا

ہوئے ہیں تڑگر یہ ندامت سے جس قدر استغنیٰ امن

کہ میری تردامنی کے لگے عرقِ عرق پاکدامنی ہے

ذوق کا مشہور قطعہ۔ کل ایک تازک دنیا سے میں نے پوچھا ذوق۔ بہت اچھا خیال کیا جاتا ہے۔ مگر اس کی زبان اور بیان سے قطع نظر کیا اس کا لہجہ متین ہے؟ یہ قطعہ تو یکسور ما۔ ذوق کے کسی شعر میں بھی وقار نہیں۔ اُن کے اشعار کی زیادہ تعداد بے لطف اور بے اثر ہے +

اگر ذوق کی سنو انیت میں کچھ کمی باقی تھی۔ تو ضرب الامثال۔ محاورات معتقدات عوام اور عام اشیاء کی محبت نے اس کو بھی پورا کر دیا پہلے محاورات کو لیتے۔ ذوق کا ذخیرہ الفاظ شاید اس قدر شاندار نہ ہو۔ لیکن محاورات کا ذخیرہ نامحدود ہے۔ یعنی دیوانِ ذوق محاورات کا ایک مستند لغت یا قاموس ہے۔ جس کی چند سطور یہ ہیں۔

شوقِ نظارہ جو جبے اُس رخ پر نور کا دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا

خاک اڑا تادشت میں گرتا سودائی پھرے پھر گولا ہے تو کیا آندھی بھی بولائی پھرے
 اس شکل سے ہوا وہ طلب گار دیدار
 صاف آئینہ کا دیدہ ندیدوں میں مل گیا

ہوا یہ سینہ یکسر خار زار دشت غم میرا کہ آیا پانچوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا
 شوقِ نظارہ ہے جسے اس رخ پر نور کا فہرک شعلہ ساسے سو بھی چراغِ دُور کا
 بل بے دشت اب تلک بھی شاخِ اکو طرح و جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا
 لفظِ قلق کی طرح سے دو ہی رہا قلق

کچھ فائدہ بے دستِ کرم اٹھ نہیں سکتا تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا
 میں سرد تہِ تنجر کیس ہو ہی چکا تھا جوں حرفِ سر کا غز نم اٹھ نہیں سکتا
 مرگِ قضا کو تیرا عاشق نہ لے مرے گا
 ہو بر، عبید سے صیاد کا جی چھوٹ گیا

اے فلک گر تھو اونچا نہ سنا بی دیرتا نالہ اس زور سے کیوں میرا دہائی دیتا
 جھوٹ ہی طاؤں کلام اُس ہزنِ ایمان کا پہن کر جام بھی وہ آئے اگر قسراں کا
 نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکیر بن جاتا اگر بالے کو لے اکیر کر مارا تو کیا مارا
 کہیں فلک پہ نہ چڑھ جائے چاند جھومر کا
 کہ دور آپ کو کھینچے ہے تیرے سر چڑھ کر

معتب گر چہ دل آزار ہے میخواروں کا دیکھے اک عالم تو ہے یار بھی یاروں کا

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا
کہاوتیں بھی محاورات ہی کی ہم جنس ہیں۔ اور ذوق کو بہت مرغوب ہیں۔
دو ہر قسم کی ضرب المثلوں سے واقف ہیں۔ اور ان کو کثرت کے ساتھ استعمال
کرتے ہیں۔

ہونا عاشق سوچ کر اس دشمن ایمان کا دل نہ کر جلدی کہ جلدی کام ہے شیطان کا
مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہو تو ان کے پاس بدگماں و ہم کی دار و نہیں لقمان کے پاس
مؤذن مرحبا۔ بروقت بولا تری آواز کے اور مدینے

پیسے میں آتشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری خدی کی گرنیں چوری تو پھر ہندے کی کیا چوری
تو کہے غنچہ اس لب پہ دھڑی خوب نہیں
چپ کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں

منتقدات عوام میں سے شاید ہی کوئی برگشتہ قسمت ہو جو ذوق کی ہمہ گیر نظر
کی گرفت سے محفوظ رہا ہو۔ وہ ایک تند گرد باد کی طرح جو کچھ اُن کی راہ میں آئے
پیسٹ پیتے ہیں۔ ذوق کو اس قسم کے مزعومات اور عام رسوم و عقاید میں
خاموش دھپی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

وہ جنانے پر مرے کس وقت آئے دیکھنا جب کہ اِذن عام میرے اقربا کہنے کو ہیں
موزیوں کو حق نہ دے انھیں کہ تالا دیں بلا عین حکمت تھی کہ معدوم البصر عقرب نے
وہ ہوں نا کام سمجھنا مگر دی جبے آئی مے مرقہ پہ جلد اس نے اُکر دوستانہ انداز
ڈھالکتا ہے مثالِ دانہ شمع کیوں منکا کہ جب ٹھہرا سفر دنیا سے کیا کام اسکا

موت اُس کو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور

یوں ترا بہما ر غم جو ہچکیاں لینے لگا

معلومات کو نظم میں ٹھپانا ذوق کا مرغوب خاطر مشغلہ ہے۔ اس حیثیت سے

وہ تمام اُردو شعرا میں منفرد خیال کہے جاتے ہیں۔ گزشتہ شعرا نے شاید ان کو کہیں کہیں بڑنا ہوا۔ لیکن ذوق کی طبیعت ان کے لئے خاص طور پر موزوں واقع ہوئی ہے۔ آپ نے وہ تمام معلومات بہم پہنچائیں جو آپ کے عہد میں فراہم ہو سکتی تھیں۔ شیخ کو ہر قسم اور ہر نوع کی باتیں معلوم ہیں۔ علوم و فنون کا رومار۔ لہو و لعب۔ غرضیکہ کوئی ایسا شعبہ حیات انہیں جس کے رموز کی ذوق کو واقفیت نہ ہو۔ ان کی معلومات کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے ان امور پر نظر ڈالئے۔

سیندور کھانا۔ چراغ دود کا شعلہ۔ سسے پر بال باندھنا۔ صیدی کا کبوتر۔ قلم آتش باز۔ مرجھایا ہوا دانہ انگور۔ پانی کا کنوئیں کی تہ میں تارا ہونا۔ کافور کا اثر۔ سیلاب کا کشتہ ہونا۔ تصویر نہالی۔ ترف سر کا غنچہ نم۔ گل ہنزارہ۔ سدرہ۔ نخل سرسازہ کا جل جانا۔ آسمان کا آنکھ کے تل میں دکھائی دینا۔ نرود کا مرکز زندہ ہونا۔ بجھا ہوا پانی گندم کا سینہ چاک ہونا۔ آفتاب حشر کا ایک نیزے پر کھڑا ہونا۔ غنچوں اور انگلیوں کا چٹکنا۔ بچکیاں لینا۔ تعویذ چاٹنا۔ غمگیناں کا کٹورا۔ فکر کے عالم میں ہاتھ کا زیر زخماں ہونا۔ ہنسنے ہی ٹھہرنا۔ دماغ کا درم کے برابر ہونا۔ کہتے کی سٹی سے کتا گھاس پیدا ہونا۔ منہ کا لا کرنا۔ آیتوں اور روایتوں سے مارنا۔ رویت دیکھنا۔ وار کر پانی پلانا۔ اور تار کا جنتری میں کھنچ کر ٹھکنا۔

ان میں سے بعض معتقبات عوام۔ بعض خالص مشاہدات و تجارب اور بعض عام معلومات ہیں۔ کہیں کہیں خاص عورتوں کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ اور گاہ گاہ عام بول چال کے الفاظ یا انسانوں کے بعض افعال کو نظم کیا ہے۔ مثلاً لڑاکا۔ منہ کا لا کرنا۔ اور مہنی کو ضبط کر کے ناخن دیکھنا۔

ذوق کی تکمیل الفاظ میں بھی تصرف کرتی ہے۔ اور اُن کو نئی نئی صدیوں میں پیش کرنے کی دلدادہ ہے۔ شیخ الفاظ کے رد و بدل اور صناعہ استعمال سے خیالی مضمون پیدا کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں تمام اقسام کے صنایع و بدایع شاید موجود نہ ہوں۔ مگر اُن کی بہتات کا یہ عالم ہے کہ سارا دیوان صنعتوں کی ایک گنجان فصل معلوم ہوتا ہے۔ یعنی صنعت بھی ذوق کے شجرِ معروض کی ایک شاخ ہے۔ جس کے ثمر یہ ہیں

ہوا احمد فدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا الف احمد کا سا بن گیا گو یا قلم میرا
جس ان کو سگ دنیا نہ پایا فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا
دلک سے اُس نے کیا مشک ہی یکسر دلوں بلکہ جل کر سوختہ غنیر بھی سارا ہو گیا
نہیں ہے جو کی اگر چشم یارِ گرد اُس کے ہجوم کرتے ہیں مژگاں کے بالکے کیا
پیرِ مغان کے پاس وہ دارو ہے جس کے ذوق ناعرد۔ مرد۔ مرد جو اس مرد ہو گیا
دل کا سازیتے گردِ غلطان کو اضطراب
پھرتا تمام عمر وہ ساحل میں لوٹتا

دردِ دل سے لوٹا ہوں میرا کس درد ہے ہوں میں لفظِ دردِ جہر سے اٹھو دردِ دہری
چمن کے بعد ہمیں جیسے سین وقافِ قفس
قفس میں بند ہیں ہم مثلِ فلکِ نافِ قفس

ہے قفس سے شیراں گلشنِ تلک فریاد کا خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا
سر بہ وقتِ فوج اُس قاتل کے زہر پاک ہے یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
تو نے گل کو سر پہ رکھا جب چمن میں توڑ کر
میں بھی حاضر ہوں کہا نے نے بہ منہ پھوڑ کر

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ذوق کس قدر ریزہ کاری کا دلدادہ ہے۔ یہ ریزہ کاری لطیف نہیں اس لئے نقش سخن میں چمک پیدا کرنے کی بجائے اُنٹا اُس کو بے فروغ بنا دیتی ہے +

محاورات۔ ضرب المثال۔ معتقدات عوام اور ریزہ کاری سے ہم متعدد نتائج استنباط کرتے ہیں۔ یہ بات ہمارے عام تجربہ میں آتی ہے کہ جس شخص کی اکتسابی قوتیں ناقص ہوں اُس کا ذہن اپنی ضرورتیں ہمیا نہیں کر سکتا۔ وہ مجبوراً دوسروں سے معلومات اخذ کرتا ہے۔ اسی طرح جس انسان کی قوت تخلیق اچھی نہیں وہ الفاظ کو خود برتنے کا سلیقہ نہیں رکھتا۔ اور دوسروں سے استفادہ کرتا ہے بجا ورا اور کہا دیتا ہے اس قسم کی معنوی ضروریات کو پورا کرنے کے آسان ذرائع ہیں جو شخص ان کو استعمال کرتا ہے۔ اپنی ادنیٰ تخلیقی قوت کا ثبوت ہم پہنچاتا ہے۔ کم از کم اُن سے یہ ضرورت ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ اظہار خیالات پر قدرت نہیں رکھتا۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے نئی معلومات نہیں ہم پہنچاتا۔ اور معمولی پیش پا افتادہ باتوں پر قناعت کرتا ہے۔ اس طرح اُس کی شاعری میں وسعت نہیں پیدا ہوتی۔ ذوق کے متعلق یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ صاحب تخیل نہیں۔ وہ اپنی تمام ضروریات تخیل سے پوری کرتے ہیں +

شعور کے لحاظ سے شیخ ایک متوسط ذہن کے مالک ہیں۔ اُن میں یہ قوت نہیں کہ انکار عالیہ یا عین معارف و حقائق کا ادراک کریں۔ اُن کو فلسفہ یا بند خیالی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔ آپ کے مداح کہتے ہیں۔ کہ آپ کے یہاں فلسفہ کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ اُن کا اصلی لب و لہجہ اور انداز نہیں۔ شاعر نے اپنی غیر فلسفیانہ طبیعت پر پردہ ڈالنے کے لئے غالب کے رنگ میں کچھ شعر کہ دیے ہیں۔ ورنہ وہ اس قدر بلند نظر

نہیں کہ معارف روحانیہ اور حقائق کونیہ کا ادراک کرے۔ اُس کا ضعیف دماغ
بلند خیالات کے رطل گراں کا تحمل نہیں کر سکتا۔ ذوق کی گرمی اندیشہ تمام
صالح و بدائع پیدا کرنے میں خرچ ہو جاتی ہے۔ وہ بلند افکار سے وحشت
کرتے ہیں۔ ان کی دلچسپی ادنیٰ باتوں تک محدود ہے۔

ذوق کی تنقیدی قوت بھی نہایت کمزور ہے۔ اُن میں اچھے برے
ادنیٰ و اعلیٰ، موزوں و غیر موزوں اشعار کی تمیز نہیں۔ الفاظ، محاورات،
مضامین ہر بات میں کوئی نہ کوئی ناگوار خصوصیت ضرور پائی جاتی ہے جس
سے ان کے کلام کا مطالعہ کلفت خاطر اور پریشانی طبعیت کا سامان بن
جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار اُن کی خود انتقادی قوت کے شکوہ سنج ہیں۔
فیض تعلیم سے تیری ہو جو منکر انساناں احمق الناس اُسے جانئے بلکہ ناساں
پہنچا ہے شب کندہ لگا کر دہاں قیہ سچ ہے حرام زانے کی رستی دلائے
وہ کہے کون ہے قراں مری اس چتون میں کہیں میں۔ وہ کہے میں کی چھری گردن
تم سی مل کر نہ غنے سے نکالا منہ کرو اور نہیں گزرتے توجاؤ کالا منہ کرو
اس صید مضطرب کو تامل سے ذبح کر

دامان داستیں نہ لہو میں لتھیر تو

اصل یہ ہے کہ ذوق ایک عالی منش شاعر نہیں۔ اُن کی کوئی قوت
اعلیٰ واقع نہیں ہوتی۔ اُن کا تخیل، شعور، مذاق اور میلانات سب کے سب
زہیں گیر ہیں۔ اُن کی نظر آسمان پر نہیں۔ ایک بلند پایہ شاعر اُن کی ہستی مذاق
کو دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ

تو مرغ زمینی خورش از خاک بجوئی
مادر عمدہ درانہ بہ انجم زدہ منقار

اور یہ کہ

راست مے گویم من و از راست سرتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

یہ درست ہے کہ شہر کی فضا انسان کی جس بصارت کو کند کر دیتی ہے۔ مگر یہ اس کو بالکل محو نہیں کر سکتی۔ ذوق میں اور قوتیں شاید اعلیٰ نہ ہوں۔ لیکن ان کی جس بصارت ضرور تیز ہے۔ وہ اشیاء کے خصائص کو محسوس کرتے ہیں۔ اور نئے نئے مشاہدات و تجارب فراہم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بالعموم اعلیٰ قسم کے نہیں ہوتے۔ ان کی نظر انفس و آفاق کے خارجی پہلو کے ساتھ بہت لگاؤ رکھتی ہے۔ شہری زندگی کے مرایا و مناظر ان کے لئے خاص دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ ان کی پرکار خیال اس مرکز کے گرد سیر و حرکت کی دلدادہ ہے۔ اور اس کی محدود دنیا سے باہر نہیں نکلنا چاہتی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ذوق کی بیشتر معلومات سطحی ہیں۔ وہ اشیاء کی اعلیٰ خصوصیتوں کا مطالعہ نہیں کرتے۔ تاہم وہ اپنے مخصوص انداز میں قدیم اور جدید سب چیزوں کا ذکر ضرور فرماتے ہیں۔ اگر وہ ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں ہندوستان کی بجائے انگلستان میں پیدا ہوتے تو ضرور ہے وہ (Hollywood) اور ڈکٹر (Scholar) وغیرہ کے ہمنوا ہوتے۔ قدیم اشیاء کا تذکرہ آپ سن آئے ہیں۔ جدید اشیاء کا استعمال ذیل کے اشعار میں کیا گیا ہے۔

میں ہوں پگڑ میں لگی جرجن سے دنیا کی ہوا
نہیں گچھ میں وہ فرنگی زاد
حال ہے میرا بعینہ آرمیائے باد کا
ماہ ہے منزل ہوائی میں
میں نے حوصلہ قدیم سرمہ سے لکھا ہم کو
کہ جیسے جلے کوئی اُشتی دھانی میں
اندر تہی عمر ہے یوں دور آسمانی میں

ان اشعار سے آپ خیال کریں گے کہ ذوق میں کچھ کچھ جدت کا مادہ بھی ہے۔ درحقیقت ان میں جدت طرازی بہت کم ہے۔ انہوں نے ایک نئی بحر نکالی جس کے متعلق ان کے مخالف کہتے ہیں۔ کہ یہ محض ایک پرانی بحر کی ترقی یافتہ صورت ہے اور جدت طبع کی آئینہ دار نہیں۔ اگر یہ طریق استدلال اختیار کیا جائے۔ تو تحفیظ کی مختصر بحر میں بھی جدت آمیز نہیں بھرہیں۔ بالیں ہمہ ذوق کی نئی بحر کے متعلق مخالف نقادوں کی تنقید بہت وزن رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے آپ کی غیر معمولی عروسی ہمارے ثابت نہیں ہوتی۔ اس سے اردو شاعری میں کوئی وسعت پیدا نہیں ہوئی۔

ذوق کی طبیعت حساس نہیں۔ تخیل کی موجودگی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کو معنویات کے ساتھ زیادہ دلچسپی نہیں۔ بلکہ وہ یہ کوشش ہی نہیں کرتا کہ اپنے حقیقی جذبات کو معرض بیان میں لائے۔ اگر شیخ اپنے احساسات کی ترجمانی کی کوشش کرتے۔ تو شاید ایک بہتر شاعر بن جاتے۔ لیکن ان کی توجہ ہمیشہ فارسی شاعری پر رہی۔ اس لئے وہ لفظی تلازمات۔ ضلع جگت اور ناز کھیلی سے آگے بڑھ سکے۔ اگر شاعری واقعی انکشافِ حیات ہے۔ اور فطرت شاعر کے دل میں ڈوب کر نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی۔ تو ماننا پڑے گا۔ کہ ذوق ایک حقیقی شاعر نہ تھے۔ وہ کائنات کا کسی خاص نقطہ نظر سے مشاہدہ و مطالعہ نہیں کرتے۔ قدرت کے گوناگوں مظاہر۔ اور زندگی کے حالات یا واقعات ان کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ ان کے حواس اس قدر مشعر اور ملکات اس قدر مددک

سے بحر متقارب سولہ بار۔ عجب تنہا نہیں ہے کہ امدادِ دل کو تپش کا مسئلہ ہو۔

نہیں کہ وہ مختلف کیفیات یا افکار کا ادراک کر سکیں۔ دیگر قدیم شاعروں کی مانند وہ آپ بیٹی سے کام نہیں لیتے۔ اُن کی مینائے سخن باوہ صدق سے خالی ہے۔ اُن کے دل اور دماغ کا ظرف احساسِ الفا کی پہلج سرکھاں سے نا آشنا ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے فلا کو مصنوعی جوش سے بھرتے ہیں۔ اس طرح اُن کی شاعری نہایت ناگوار بن جاتی ہے۔ جیسا کہ ذیل کے شعروں سے بخوبی ظاہر ہے۔

ہے جی میں اپنے غم جو ہر کو توڑ دوں آئینہ عیاں لکڑ کو توڑ دوں
میں کاٹ دوں پہاڑ کو پتھر کو توڑ دوں پر کیونکہ خیر کو بُت کا فرسے توڑ دوں
پھر اُس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں وق نشتر چھو کے میں سر نشتر کو توڑ دوں
پھروں کھینچے ہوئے کوسوں میں اپنے زورِ دشت سے

اگر بندھ جائے میرے دامن کہسار دامن سے
میں کہاں سنگِ دریا سے ٹل جاؤں گا
نہ وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤں گا

کہا جائے گا کہ اگر ذوق کی شاعری بڑھتی ہے۔ تو اُس کے بہت سے اشعار کیوں بلند پایہ کیوں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں ان اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ اگر ذوق کے تمام کلام کو سامنے رکھ کر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہو گا۔ کہ شیخ میں شعر کہنے کی صلاحیت نہیں۔ اُن کے اچھے شعر بھی مصنوعی اشعار کے ہجوم میں غیر خوش آئند معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے اکثر اچھے شعر اتفاقی ہیں اور اتفاقی باتوں سے شاعر کی بلند پایگی ثابت نہیں ہوتی۔ پھر اُن کے عمدہ اشعار بھی زیادہ تر ایسے ہیں کہ اُن کو پڑھ کر شاعر کی صداقت کا یقین نہیں آتا۔ اُن میں ہم کچھ جاذبیت ضرور محسوس کرتے ہیں۔ لیکن بندش۔ مضمون یا زبان میں کوئی نہ کوئی نقص ایسا پایا جاتا ہے

جو اس کے اثر کو رایل کر دیتا ہے۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ذوق کے یہاں دس شعر بھی ایسے نہیں جن کو بے عیب کہا سکے۔ اور کچھ نہیں تو بلند پایگی کے اعتبار سے اُن کے بہترین اشعار درمیان درج کے نکلیں گے۔ مثلاً ان شعروں کو لیجئے ۵

اپنی خوشی نہ آئے۔ نہ اپنی خوشی چلے	لائی حیات آئی قضا۔ لے چلی چلے
ہو گیا جس طرح کوئی دم گذارا ہو گیا	ہے مقام زندہ کی زیر دم شمشیر مرگ
برنگ اشکِ حزنگان منتظر ہوں اک تار کا	سرداو فنا میں ہوں مہیائے سفر لیکن
گر آج بھی وہ رشک سبیا نہیں آتا	جینا ہمیں اصلاً نظر اپنا نہیں آتا
آنا ہے تو کیا آنا۔ جانا ہے تو کیا جانا	آنا تو خوف آنا حبابا تو رُلا جانا
جیسے ساقی کی طرف باز پس جامِ شراب	ماز گشت اپنی ہے یوں جانِ تمام ازل
پروانہ ہوں چراغ سے دُورا و شکستہ پر	بہل ہوں صحنِ بلوغ سے دُورا و شکستہ پر

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو

تجھ کو پرانی کیا بنی۔ اپنی مبیڑ تو

ان اشعار کو اُس محفل میں دیکھئے۔ جن سے ان کو علیحدہ کیا گیا ہے۔ ہر ایک شعر سے ایسا معلوم ہوگا کہ شاعر کے قلم سے چوک ہو گئی ہے۔ اور وہ ایسی بات قلمبند کر گیا ہے جس کی اُس سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے بعد ان اشعار کی بندش پر غور فرمائیے۔ پہلے شعر میں وہی لفظی رعایتیں ہیں۔ جو اتفاقاً موزوں ہو گئی ہیں۔ ذوق کی کوشش زیادہ تر الفاظ کی طرف ہے۔ معنی کی طرف نہیں۔ دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں پھر وہی لفظی نمائش ہے۔ تیسرے شعر میں لفظ نہیں صریحاً جھرتی کا لفظ ہے (برنگ) ذوق کا تمکیر کلام ہے۔ اور یہ جیسے بچوں و خیرہ کی طرح از حد ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ چوتھے شعر میں مصرعوں کی

جگہ تبدیل کر کے دیکھئے۔ شعر کی قدر و قیمت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ پانچویں شعر میں لفظی تلمیحات ہیں۔ جو انفاً موزوں ہو گئے ہیں۔ چھٹے شعر کو اس غزل کے دیگر اشعار کی صف میں دیکھا جائے تو اس کا مضمون قافیہ کی آفرینش معلوم ہوگا۔ ساتواں شعر ایک ایسی غزل کا مطلع ہے۔ جس کی بنیاد ردیف پر ہے۔ یعنی 'دُور اور شکستہ پڑ۔ اس سے ناع کے صدقِ بیان کی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ آخری شعر کی تاسو و زین تشریح کی محتاج نہیں۔ اس کی شکل و صورت بھی اپنے ہم طرح حربوں کی مجلس میں بدرِ نامعلوم ہوتی۔ ہے +

واضح رہے کہ ہم جان بوجھ کر ذوق کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے۔ اوچکھ کہہ رہے ہیں۔ اشعار کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر کہہ رہے ہیں۔ شاعری منفرد اشعار کا مجموعہ نہیں۔ یہ اصولوں کی ظاہری یا فروعی صورت ہے اور اسی حیثیت سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ذوق کے اچھے اشعار صمیم اصولوں کی تخلیق نہیں۔ بغرض محال اُن کو عمدہ اشعار تسلیم کر لیا جائے۔ پھر بھی یہ بلند پایہ شاعری کی سطح سے بہت نیچے رہتے ہیں۔ ذوق کے اچھے اشعار سے کبھی متنانت۔ اعلیٰ تکمیل حقیقی جوش اور سوز و گداز کا احساس نہیں ہوتا۔ ذوق تو کیا۔ میر کے اشعار بھی ان ہی اہمیت بلند کے رتبہ کو نہیں پہنچتے۔ غالب کے ان اشعار کو پڑھئے اور موازنہ فرمائیے۔ کہ ان کے مقابلہ میں دیگر شعرا کے رشحات کی حیثیت کیا ہے۔

منظر اک ہنس رہی پرو اور ہم بنا سکتے	عرش سے ادھر ہونا کا شکے مکاں اپنا
ہم کو معذرت ہے جنت کی حقیقت لیکن	دل کے خوش رکھنے کو غالب یں خیال اچھا
گرتے جی میں ہونیالہ صل میں شوق کا زول	موج محیط آب میں لائے ہے ست دہا کیوں
قیدِ جفا و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں	موسم پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہے آدمی سجائے خید اک محشر خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں غلوت ہی کیوں نہ ہو
دل ہر قطرہ ہے ساز انا بسحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پچھن کیا
پہناں تھا دام سخت قریب آشیاد کے اُونے نہ پائے تھے کہ گردنار ہم مجھے

یہ اشعار اتفاقاً سرزد نہیں ہوئے۔ ان کی محفل بہذب محفل ہے۔ اور ان کی اپنی شکل و صورت بھی ایسی نہیں کہ ان پر خذہ و نسا کا انہار ہو سکے۔ یہ شاعر کی شوخی انارشہ کے غنچہ و گل ہیں۔ قافیہ یا صنایع و بدائع کے شاخ و برگ نہیں۔ نتیجہ کا اعلان کرتے ہوئے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ذوق کے اکثر چھے اشعار کی ذمہ داری طح ضرور ناقص ہیں۔ اور صحیح اصولوں پر مبنی نہیں۔ جو شعر واقعی اچھے ہیں۔ اس قدر بلند پایہ اور اس قدر زیادہ نہیں۔ کہ شاعر کو اُس قابل رشک شہرت کا مستحق ٹھہریں جو اُس کو خوش قسمتی سے حاصل ہو گئی ہے۔ اگر ذوق میں شعر گوئی کا مادہ تھا۔ تو اس قدر کم کہ وہ بمشکل ایک متوسط درجہ کے شاعر بن سکے۔ بعضوں کی رائے میں جن میں تم بھی شامل ہیں۔ وہ اس سے بھی لم پایہ شاعر تھے۔

شخصیت

اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ شیخ کس قسم کے انسان تھے۔ اُن کے خیالات و عادات و خصایل ارتکاب ڈھنگ کیا تھا۔ آپ نے اپنی زندگی کی منزلیں کس طرح طے کیں اور گرمی و سردی زمانہ کا آپ کی طبیعت پر کیا اثر ہوا۔ غالباً یہاں اس بات کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ شیخ ہمارے نزدیک ایک عام شاعر ہیں۔ آپ کی فطرت میں بلندی نہیں۔ مگر آپ کی فطرت میں شرافت نفس کی کچھ کچھ علامات پائی جاتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ایسی عادات و خصایل بھی ہیں۔ جو آپ کو ہماری نظر سے گرا دیتی ہیں۔

نصیحہ نگری کے لحاظ سے ذوق دوسرے سعدی ہیں۔ اُن میں سعدی مصطفیٰ اور متانت نہیں۔ لیکن اُن کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ بعض اخلاقی باتوں پر بہت زور دیتے ہیں۔ وہ خود ایک راستیاز اور پرہیزگار انسان ہیں۔ اس لئے اوروں کو بھی نیک نشی اور راست روی کی تلقین فرماتے ہیں۔ سعدی کی 'بوستان' کا شاید ہی کوئی باب ہو جس کا مضمون ذوق نے قلمبند نہ کیا ہو۔ سخاوت، کرم، عدالت، گزینی، توکل، صفائے دل، بے ریائی، صداقت، عجز و انکسار، ترک تکبر، حرص، ہوا کی مذمت، ہر قسم کے اخلاقی مضامین ذوق کے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً -

دنیا کا زرو مال کیا جمع تو کب ذوق	کچھ فائدہ بے سب کرم اٹھ نہیں سکتا
پل بنا چاہ بنا۔ مسجد و تالاب بنا	نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
چہ کربس دامن الیاس گریہ پختائیں ہم	کہ بدتر دُوب کر مئے سے ہے جینا سدا کا
نے اکیر گیس کشت قیوں میں لوں ہرگز	مے مذہب میں غل کر نہ ہے کشت کرنا پار کا
کویت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ	پست ہمت یہ نہ ہو جو پست قلمت ہو تو ہو
لے ذوق تکلف میں سے تکلیف سراسر	آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا
دکھ نہ جوش و خروش اتنا زور پر چڑھ کر	گئے جہاں سے ہیں دریا بہت اتر چڑھ کر
بفتادہ و دوطریق حسد کے عدد سے ہیں	اپنا یہ ہے طریق کہ باہر عدد سے ہیں
سر نہ چشم عزیزاں نہ بنا میں اسے چرخ	کیا جفا خاک خباہتِ دل احباب بنا
سے بارغ جہاں میں بچھے گر ہمت عالی	گر گردن تسلیم کو غم اور زیادہ
اسے ذوق کسی ہمدرد دیرینہ کا دنیا	بہتر ہے ملاقات سیما و خضر سے
نہ تھی تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے	عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جو ان کیلے

نہیں نبات ہندی عز و شائ کے لئے
کہ ساتھ اوج کے بہتی ہے آسمان کے لئے

یہ طویل فہرست اس لئے دی گئی ہے کہ اس سے ذوق کی طبیعت کے تمام خط و فال اچھی طرح واضح ہو جائیں۔ ان اشعار سے ظاہر ہے کہ شاعر زہراندوزی۔ دنیا پرستی۔ ایذا دہی۔ تکلف۔ ظلم۔ تکبر۔ اور رشک و حسد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور سخاوت۔ خدمتِ خلق۔ آزادی و عدالت خود اعتمادی۔ آدمیت۔ دل کی صفائی۔ تسخیرِ نفس۔ قناعت۔ عزت گزینی انکسار۔ دوست نوازی۔ ہمدردی۔ محبت اور راستی کو پسند کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ذوق ان میں سے بہت سی باتوں پر عملی طور سے کاربند تھے۔ لیکن بعض اوقات وہ اپنے مقولوں اور عقیدوں کے بالکل برعکس کام کرتے تھے۔ ان کی ساری زندگی تحصیلِ زر کے شوق میں گزری۔ وہ مستغنی المزاج ہونے کی بجائے ہمیشہ بندہ دنیا رہے۔ وہ مدتِ العمر اپنی شاعری پر ناز کرتے رہے۔ ان کے سخوت اور تکبر نے اس قدر ترقی پکڑی کہ وہ دیگر اہل کمال پر رشک کرنے لگے۔ شیخ بلند مزاج شعرا کی مانند کبھی آزادہ ردی۔ صلح کل اور عزت گزینی کے مقولوں پر کاربند نہیں ہوئے۔ مندرجہ ذیل اشعار زہر میں نبکھے ہوئے نظر ہیں جو بظاہر بہت بے ضرر لیکن دراصل نہایت جہلک ہیں۔

ذوق یاروں نے بہت زوغل میں مارا	نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
نعل کیوں اس لئے تائیدِ نشان چھوڑ کر	اہل جوہر کو وطن میں رہنے دینا گرفتک
عدو کی سرکشی سے ذوق کب تک ہو کم میرا	نہ ہو بے وقوف ترکِ سب سے اہل بیت آدم
بکتا پھر تپے گھر۔ ہو کر سمندر سے جدا	ذوق ہے ترکِ وطن میں صاف نقیضِ برو

قسمت ہی سے ناچار ہوں اے ذوقِ دگر

برف میں ہوں میں تاک مجھے کیا نہیں آسما
پہلے شعر میں ذوق نے اپنے مخالفوں پر چوٹ کی ہے کہ وہ میر کے متبع ہیں

کامیاب نہیں رہے۔ لیکن انہوں نے سودا کا متبع کیا اور کامیاب اُترے یارور
کا اشارہ متبعین میرزا خصوص مرزا غالب کی طرف ہے۔ تیسرے شعر میں بھی
غالب اسی صاحب کمال پر زبان طعن دراز کی ہے۔ اور آخری شعر میں اپنے کمال
پر فخر کر کے بے زری کی شکایت کی ہے۔ گویا بادشاہ کے تمام انعام و اکرام اُن
کی شاعرانہ استعداد کے مقابلہ میں پہنچ نہیں سہی شعر اس بات کا کافی ثبوت مہیا
کرتا ہے۔ کہ ذوقِ نئی ہند کہاں تک قانع اور سیرِ چشم تھا۔

ترک و وطن کی نسبت جو شعر کہے گئے ہیں۔ اُن میں بھی حریفوں پر طعن ہے۔
یعنی وہ خاکِ وطن کو چھوڑ کر پردیس میں گئے۔ گریہاں سے سرگشتہ و ناشاد
واپس آئے۔ ذوقِ وطن بھی میں رہے۔ اور دوسروں کی طرح رسوا
ہوئے۔ ایک اور شعر میں آپ فرماتے ہیں کہ

ان دنوں گرچہ درگن میں ہے بڑی قدر سخن

کون جارے ذوقِ پردہ کی گلیاں چھوڑ کر

بظاہر اس شعر کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذوقِ پردہ کی گلی کوچوں کے ساتھ
بہت محبت ہے اور اُن کی جدائی آپ کو گوارا نہیں۔ وہ کسی چیز کے لالچ میں وطنِ بونی
کو خیر باد نہیں کہہ سکتے۔ لیکن وطن کو نہ چھوڑنے کا اصلی سبب یہ نہیں۔ درحقیقت
ذوقِ مائتو سفر کو پسند نہیں کرتے اور ایک ہی جگہ آرام سے رہنا چاہتے ہیں۔
یادِ دیگر اہل کمال کی اُشفقتِ عالی اور بے سرو سامانی کو دیکھ کر ہمدردی میں
ذلیل و خوار ہونا چاہتے۔ فعل کیوں اس رنگ سے آتا یا خشاں چھوڑ کر
اس شعر میں اس رنگ سے اشارہ فعل کے سراپا خون ہونے کی طرف
ہے۔ یعنی ارباب کمال کو ترک و وطن سے سرگشتگی اور مصیبت کے سبب
اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ان ہاتھوں سے ظاہر ہے۔ کہ ذوقِ وطن پرستی

کا اصلی سبب کیا ہے۔ وہ حافظ کی طرح سفر سے ڈرتے ہیں۔ گویا بل شیراز
ذوق ہی کی زبان میں کہتا ہے کہ

بس آسماں سے نمودا دل بچھریا بہ بٹھے مید

فلط لغم کہ ہر محش بعد گدہ ہر نئے ارزد

یہ جمود اور ہرجا ماندگی ذوق کے صفحہ طبعیت کا ایک غیر خوش آئند نقش ہے۔

مجموعی حیثیت سے ہم ذوق کی طبعیت کے متعلق اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں

کہ وہ ایک وضع کے بائند اور برائی قسم کے راست باز شخص تھے۔ اُن کا مزاج

رہد خفک کی طرف بہت مایل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تصوف کے شریعت

ہیں، حقیقی صوفی دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن صوفیانہ شعر کہنے والوں کی تعداد

بہت زیادہ ہے۔ ذوق کو تصوف میں بہت دلچسپی تھی اور وہ حقیقتاً بعض صوفیانہ

عادات و خصائل رکھتے تھے۔ آپ نے تصوف کے مسائل کو خوش اسلوبی

سے بیان نہیں کیا۔ پھر بھی شیخ کے ہمہد سے اشعار ایسے ہیں۔ جن سے اُن کا

صوفیانہ مزاج ظاہر ہوتا ہے۔ رہدا اور نصیحتگری۔ تصوف سے زیادہ دور نہیں۔

جو شخص اخلاق تجر نفس اور پاکبازی کی تعلیم دیتا ہے۔ یا اُن کے متعلق شعر کہتا ہے

بڑی حد تک تصوف ہی کے مسائل نظم کرتا ہے۔ ذوق بذاتِ خود صوفی نہ سہی

پھر بھی آپ کی زبان پر نہ طبعیت آپ کو اہل تصوف کے قریب ضرور لا کھڑا کرتی

ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

نہ مارا آپ کی جو خاک ہو اکیر بن جاتا اگر پارے کو اے اکیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موزی کو مارا نفس اتارہ کو گر مارا ہنگ اڑا دیا و شیر نہ مارا تو کیا مارا

اسے ذوق گر ہیں ہوش تو دنیا دور بھاگ اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

بے نشان پہلے فنا سے ہو جو ہو تجھ کو فنا ورنہ ہے کس کا نشان ذوق فنا نے رکھا

باز گشت اپنی ہے دین جانب تسلیم ازل جیسے ساقی کی طرف باز پس جام شراب
 سا غرول کی تو واقف نہیں کیفیت سے دیکھ عکس رخ ساقی ہے اسی عالم میں خاص
 نظیر اس کا کہاں عالم میں لے فوق کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

ذوق اسمائے الہی ہیں سب اسم عظم

اس کے ہر نام میں عزت ہے نہ ہر نام میں خاص

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ذوق نے تصوف کے بہت کم مسائل نظم کئے
 ہیں۔ اسی وجہ سے قاری کو یہ شبہ گذر سکتا ہے۔ کہ شاعر نے ان کو محض کلام
 کو پر لطف بنانے کے لئے نظم کیا ہے۔ ذوق واقعی اس طرح کے شعر بھی کہتے
 ہیں۔ لیکن ان کی زابدانہ سرشت ظاہر کرتی ہے۔ کہ ان کا تصوف کی طرف میلان
 طبیعت کچھ تعجب کی بات نہیں۔ خواہ یہ میلان نہایت خفیف ہی کیوں نہ ہو
 ان کی مذہبی طبیعت اور تقاریر پرستی بھی ہیں۔ اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ چنانچہ آپ
 لکھتے ہیں

جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا حکیم ازلی ذوق یونہیں ہو ہی چکا تھا
 نشتے سے ہوا اک حرف بھی ہرگز نہ بیش و کم جو پیشانی میں تھا لکھا ہوا وہ پیش سب آیا

مطلب سے اپنے کون ہے آگاہ ہر خدا

جوں خط سر نوشت ہیں پیشانیوں میں ہم

حب حسین ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حر سبطین بنی یعنی حسن اور حسین
 تھا اگرچہ اشتیاق میں سعیدوں میں مل گیا زہرا و علی کے دونوں وہ نور العین
 عینک ہے تماشائے دو عالم کے سنے اسے ذوق نگاہ کھول سے ان کی نظیر

اے ذوق کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا اک دم نہ ترا صرف مناجات ہوا
تھا جب کہ جوان تھا جوان بدست ہوا جب پیر ہوا پیر خسرات ہوا
ذوق نے بیخودی اور از خود رنجی کے مضمون بھی بہت باندھے ہیں۔ فرما
ہیں۔

وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے خدائی میں اگر دھونڈھا نہ پایا
رہ گم گشتگی میں ہم نے اپنا غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا
جا بجا نام وہ جوں نقش قدم چھوڑ گیا خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈھنے عنقا ہم کو
گرچہ ہوں وادی عنقا سے پرے لکھوں کس بیک ہے گم شدگی کی ابھی منزل آگے
یہ تمام اشعار تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ کامصدق ہیں۔
ذوق حقیقت میں سالک کو نین میر یا صوفی با صفا نہیں *

ایک اور بات جو آپ کو صوفیوں اور شاعروں کا ہم نشین بناتی ہے۔ آپ کا
احساس فنا ہے۔ اور غالباً یہی آپ کی شاعری کا وہ مضمون ہے جس کا آپ کو حقیقی
احساس معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی بے اعتباری۔ زندگی کی بے ثباتی۔ عمر کی تیز رفتاری
اور صحیفہ قدرت کی درس آموزی کی نسبت ذوق نے جو شعر کہے ہیں۔ ان میں کسی قدر
صداقت نظر آتی ہے *

غافل جو دم کی آمد و شمس نہ ہوگا تو ہر دم ہے تجھ کو سیرِ وجود و عدم نصیب
اس گلستانِ جہاں میں کیا گلِ عشرت نہیں سیر کے قابل ہے یہ پدیر کی فرصت نہیں
گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں کہ جیسے جلے کوئی کشتیِ دغانی میں
ہستی تنگ مایہ نے پھونکا ہے کچھ ایسا ابھرے ہے حبابِ یم اور زیادہ
ہنگامِ گرم ہستی ناپاؤار کا چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
یہ اقامت ہیں پیغامِ سفر دیتی ہے زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

سر راہ فنا میں ہوں بہتائے سفر لیکن
ہر گنگ اشکِ گلستانِ منتظر ہوں ایک اشائے کا

دامِ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو کئے ہے جز میں نظر کُل کا تماشا ہم کو
نہیں گزشتہ شواہدِ باغِ جہاں میں غافل
ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا
دوسری قسم کے شعربہت کم ہیں۔ پھر بھی ان سے ذوق کی طبیعت پر کافی
ردِ شنی پڑتی ہے +

عزل کا میدان بہت محدود ہے۔ اور شاعر کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ
مغربی تشبیل نگاروں کی مانند افراد کی سیرتوں کا مطالعہ کرے۔ وہ مجبور ہے
کہ ان کے اخلاق و عادات کو مفرد اشعار میں بیان کرے۔ ذوقِ انسانی فطرت
کی بعض خصوصیات پر اسی طرح ضرور ہنری کرتے ہیں۔ یہ بھی اُن کی نا صحابہ طبیعت
کے نتائج ہیں۔ جن کو ایک مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً

کیوں اتنا گراں بار ہے جو زادِ سفر بھی اے راہِ رملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا
نفسِ بے متذکرہ کو قدر ہو گر تھوڑی سی بھی دیکھ پھر سامانِ اس فرعونِ بے سامان کا
ذکر دنیا نفسِ مردہ کو ہوا آسویات مر کے یہ سہماں پھر زندہ دوبارہ ہونیا
مختصِ گرمِ دل آزار ہے میخواروں کا دیکھے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا
منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے گر حریصوں کو خدا ساریِ خدائی دیتا

گی شیطاں مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے

اگر لکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

بعض اوقات یہ خیالات طنز کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ شاعر انہوں

اور واعظوں کے طور و طریق اور فریب کاریوں کی پردہ دری کرتا ہے۔ یہ ازرق پوش طائفہ ذوق حیات سے بیگانہ ہے۔ اس لئے زمانہ تو خود زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں مدد سروں میں زندہ دلی دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زہد اور رندی میں مدت سے جنگ چلی آتی ہے۔ ذوق طبیعت کے لحاظ سے زاہد خشک ہیں۔ مگر وہ پھر بھی شاعروں کے زمرہ میں داخل ہیں۔ اور زاہدوں پر طعن و تشنیع کے آواز سے کہنے میں تامل نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ

ذوق زیبا ہے جو موریش سفید شیخ پر دسمہ آپ بنگ سم جندی سے گل رنگ سے
مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار یہ بھی ہے اُس کے ان شجر کو دفن کی شاخ
شیخ صاحب کے ہیں نزدیک ہا صان خدا خدمتی اُن کے جو ہیں علقہ غلام میں خاص
گرا بکے پھرے جیتے جی کعبہ کے سفر سے تیرا جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے
باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی کانا کرے گا۔ منہ بھی جوڑاڑھی یہ کی

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے

حوروں پر مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

معصیت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آدم اور حوا کا افسانہ آج بھی انسان کے ضمیر کی زندہ تمثیل ہے۔ اہرمن ابتدائے آفرینش سے غول آدم میں مشغول ہے۔ انسان اُس کے فریب میں اگر حسیض نکبت میں غرق ہو جاتا ہے لیکن گناہ کی پستیوں میں بھی اُس کی نظر بلند رہتی ہے۔ روحانیت کا شوق اُس کے دل سے محو نہیں ہوتا۔ وہ اپنی گمراہیوں کو بھی صلاح کار اور تنزل کو روحانی ترقی کا رہنہ بناتا ہے۔ اس لئے انسان کتنے ہی با محمود افعال کا مرتکب کیوں نہ ہو۔ اُس کو سبب باطن اور ضمیر باعث قرار دینا کو تا ہی فکر کی دلیل ہے۔ ظاہر میں شخص اپنے ہم جنموں کے عیوب پر بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ اُن کی مذمت

اور سوائی میں سعی بلیغ کرتے ہیں اور اُن اندرونی احساسات کے تموّج سے بے خبر رہتے ہیں۔ جو انسان کے سینہ میں موجزن ہوتے ہیں یہی احساس ہے۔ جو انسان کو تمام آفرینش سے ممتاز کرتا ہے۔ اور حقیقی معنوں میں اشرف المخلوقات بناتا ہے۔ جب زوال اور منتزل انتہائی پستی کو پہنچ جاتے ہیں۔ تو ضمیر کی ندائے غیبی تازیانہ بن کر انسانوں کو راہِ راست کی طرف لاتی ہے۔ ایک گناہگار کا دل کیفیتوں کے رستخیز کا نظر فرب تماشا گاہ ہے۔ جس کا صرف ہمدرد نگاہیں تماشا کر سکتی ہیں۔ قدرت نے انسان کو خطاؤں پر نادم ہونے کی اہلیت بخش کر اُس کی فطرت کا اہلیت کے ساتھ رابطہ استوار کر دیا ہے۔ وہ جس قدر گناہوں اور تاریکیوں میں گم ہوتا ہے اُسی قدر ہدایت اور نور سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اس دنیا میں جس قدر تجربہ حاصل کریں۔ ہماری روحانیت کو ترقی ہوگی۔ معلومات کی وسعت طبیعت میں بھی وسعت پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انہی انسانوں کو دنیا کی سب سے بڑی ہستیاں خیال کرتے ہیں۔ جن کا تجربہ اور مشاہدات زندگی کی طرح عمیق اور کائنات کی طرح وسیع تھے۔ غالب نے درست کہا ہے سے

حسد سے دل اگر افسردہ ہے وقفِ تماشا ہو

کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

ذوقِ دایم ہستی کے مختلف پھندوں کا شکار رہنے۔ اُن سے بہت خطا میں سرزد ہوئیں۔ انہوں نے مصیبت کے دریائے طوفانِ خیز میں غوطے کھائے۔ لیکن اُن کی فطرتِ سلیم تھی۔ اس لئے وہ ساحلِ نجات پر پہنچ گئے۔ ہم تک اُن کی زندگی کے تمام حالات نہیں پہنچے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُن سے کونسی لغزشیں ہوئیں۔ اتنا ظاہر ہے۔ کہ اور انسانوں کی مانند انہوں نے بھی اس خارزار میں قدم رکھا۔ تکلیفیں اٹھائیں اور ان اشعار کو اپنا ترجمانِ حال بنایا

ہوئے ہیں ترگریہ ندامت سے اس قدر استین و دامن
 کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاکدامنی ہے
 آگ دوزخ کی بھی بوجھائے گی پانی پانی جب یہ عاصی عرق شرم میں تر جائیں گے
 ظلمتِ عمیاں سے میہ بن گیا شب کو اختر آفتاب اک نیزے پر دیدار تارا ہو گیا
 بے سیما ہی نہ چکا کام قسم کا اسے ذوق رویا ہی سرو سامان ہے بسیہ کا جلا
 خریدار اس کی رحمت چس غصیاں کی ہے گریہ سے
 چھوٹک کر بچتا ہوں نفع پر سودا خسارے کا
 ذوق ایک مدت لذایذ دنیوی کے دلدادہ رہے۔ ان میں سے ایک نے نوشی ہے۔
 جو تمام شعرا کے نزدیک شرابِ حلال ہے۔ شیخ اس سے ثابت ہونے کے بعد فرماتے
 ہیں کہ

اے ذوق چھوڑو اختر زر سے نہ منہ لگا
 جھٹتی نہیں یہ منہ سے یہ کافہ لگی ہوئی
 ادرا اس معنوں کو وسعت دے کر تمام لذایذ کایوں احاطہ فرماتے ہیں کہ
 جتنے مزے ہیں یاں صفتِ نشہ و شراب
 ہو جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے عذ ہیں
 ذوق کا رشک و حسد محتاجِ تفریح نہیں۔ اس موضوع کو طول دینا نہ شاعر
 کے لئے باعثِ شرف ہے۔ نہ نقادوں کے لئے باعثِ سعادت۔ شاعر
 رشک و حسد کے باوجود ایک سلیم الفطرت انسان ہے اور محسوس کرتا ہے کہ
 اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھے
 سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں
 دنیا کے مصائب اور رنج و غم انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں بقول

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں

رنج و غم - تکلیفیں - اور حوادث زمانہ انسان کے دیدہ دل کو مینا - اخلاق
کو بلند - طبیعت کو حساس - اور دماغ کو روشن کرتے ہیں صبیح المشرقی - وادئہ مزاجی
ہمدردی - انکسار اور خوش خلقی اسی نکتہ روشن کی تفسیر میں ہیں - ذوق کی زندگی ایسے
ماحول میں بسر ہوتی جو آفتوں اور مصیبتوں کے لحاظ سے ایک طوفان خیر زمانہ
تھا - ذوق نے زمانے کی بہت ٹھو کریں کھائی - یہاں بھی اُس کے مالک زندگی
ہماری مدد نہیں کرتے - ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے - کہ وہ اسباب کیا تھے جنہوں
نے شاعر کی طبیعت کو حزن و غم کی طرف مایل کر دیا - شیخ کی زندگی اس قدر
آرام و آسائش کے ساتھ گذری کہ ہم اُن کے حزیہ اشعار سے متعجب ہوئے بغیر نہیں
رہ سکتے - بعض اشعار صریحاً رسمی یا سہرستی پر مشتمل ہیں - مثلاً

بیمار ترا صورت تصویر نہائی کیا اُٹھے سر سبز غم اُٹھ نہیں سکتا
لے ذوق بیکے طائر دل کو کہاں فراغ کو سوں سے زراغ سے دور اور شکستہ پر
وادی ظلمت میں اپنی دخل ہے کب نور کا ہر اک شعلہ سا ہے وہ بھی چراغ دور کا
جوں دائرہ روئیدہ نہ سنگ ہمارا سر زیر گرانبارِ الم اُٹھ نہیں سکتا
باندھوں میں مضمون جو اپنی شو بختی کا کوئی

ہو زمین شعر میں عالم زمین شور کا

لیکن بعض اشعار میں حقیقی جذبات کا عکس نظر آتا ہے - غالباً یہ اُن کی
حزینہ ایشیائی سرشت کا نتیجہ ہیں - اگر اس کا باعث زندگی کے معمولی غم انگیز
واقعات ہیں - تو ذوق کی لئو انیت کا نظریہ اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے - بہر حال

جو کچھ حوادثِ زمانہ نے اُن کی طبیعت پر اثر کیا۔ سندرمہ ذیل اشعار کی صورت میں روٹنا ہوا۔

ہنسی کے ساتھ یاں دنا ہے مثلِ قفلِ مینا
کسی نے قبہ لے بے خبر مارا تو کیا مارا
کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم لے دوستی
لہو نہ دالے ہیں سب ہم سے عنقریب جدا
برنگِ غنچِ نوینِ دل ہنسے کیا اس گلستان میں
بھرا یا خونِ منہ میں گر تبسم زیر لب آیا
جہاں میں غمِ عسرت سے سوادہ جزد ہے غم کا
گل پریشان ہوا ہنس کے چمن میں آخر
نواہ پھرتی ہے زمین ادھولہ پھرتا ہے فلک
روزِ آفتاب نئی ہیں دل پر مَحْن کے ساتھ
گر یہ جانتے چن چن چن کے ہم کو تو طریں گے
عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم
تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے

یہ اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ شاعر زندگی کے تاریک پہلو سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ دنیا میں غم ہی غم دیکھتا ہے۔ مصیبتیں اور بلائیں اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اُس کی دنیاوی زندگی اچھی طرح بسر نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ ڈرتا ہے۔ کہ کہیں حیاتِ بعد المات میں بھی اُس کو آفات و بلیات کا سامنا کرنا پڑے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہ عالمِ یاس کا شعر ہے۔ لمحاتِ فکر میں ذوقِ تسلیم و رضا سے کام لیتے ہیں۔ یا فلسفیانہ حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔

لے شمع تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گزار دے

ذوقِ اس بحرِ جہاں میں کشتی عمر رواں
جو حلاوتِ زندگی کی چاہتا ہے چرخ سے
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا
کاسۂ زہراب سے کرتا ہے شربت کی طلب
ہو گیا جس طرح کوئی دم گذارا ہو گیا
ایک دم عمر طبعی ہے یہاں مثلِ حباب
فکرِ امروز ہے نے کچھ غم فردا ہم کو
اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خدا نڈیاں

بہشت ہے ہمیں آرامِ جادواں کے لئے

مذہب کے لحاظ سے ذوقِ ایک متشدد شیعہ ہیں۔ اُن کے اعتقادات
عوامِ اناس کے اعتقادات سے زیادہ ترقی یافتہ اور مذہبِ ہنٹیں۔ اُن کی
عوام کے ادب و مزعومات سے دلچسپی۔ تغنن یا شاعری ہی کے لئے نہیں۔ وہ
ایک مددگار اُن میں خود بھی یقین رکھتے ہیں۔ زندگی کے تجربہ نے اِس صفت
سے بھی اُن کی چشم تنگ کو وسعتِ نظر کا حامل بنایا۔ اور اُن سے کہلوا یا کہہ
ہوئے ہیں اِس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگِ ہشتی سے
اگر نہ یہ ہو تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

کوئی ہے کافر کوئی مسلمان جدا ہر اک کی ہے راویاں

جو اُس کے نزدیک رہبری ہے وہ اِس کے نزدیک ہنٹ ہے

ناہمی تنگ نظری یہاں وسیع الشربہ۔ آزاد نگاہی اور صلحِ کل میں تبدیلی
ہو گئی۔ کہے ذوقِ جیسے غیر اقدامی شخص کے لئے یہ بھی بہت ترقی ہے +
جوں جوں انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اُس کی ذہنی رفتار میں تبدیلی
پیدا ہوتی جاتی ہے۔ بچپن سادگی۔ معصومیت اور بے فکری کا زمانہ ہے۔ شباب
ہوش بہمت۔ الو العزمی اور سرگرمی پر ناز کرتا ہے۔ پڑھاپا، شعور کی انتہائی
ترقی اور بالغ نظری سے ہم آغوش ہے۔ انسان اِس آخری منزلِ حیات پر

پہنچ کر گذشتہ مرحلوں پر نظر ڈالتا ہے۔ تو اُس کا دل خیالات، احساسات اور نگری ہوئی
 دلچسپیوں کا ہنگامہ زار بن جاتا ہے۔ رفنگان کی یاد، عزیزوں کی جدائی، احباب کی دوری
 اور شباب کے رخصت ہونے کا غم انسان کے دل کو نرمی اور ہمدردی کا مرقع بنا
 دیتا ہے۔ دنیا کا تجربہ اُس کے سینے میں الہی اور سرمدی معرفت نہیں۔ تو ایک قسم کی،
 دنیاوی معرفت ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ براؤنگ کاربئی بن عذرا اس
 قدر والہیت کے ساتھ بڑھا ہے کی تعریف کرتا ہے۔ ذوق اس عالم پیری کے شعور
 اور معرفت کے لطف سے اُسٹنا معلوم ہوتے ہیں ایسی نئے اپنے یہ عارفانہ شعور کہے
 آتی پہنچی سرگرداب فنا کشتی عمر ہر نفس باد مخالف کا ہے جھونکا ہم کو

نہیں جڑے مزگی کوئی مزا دنیا میں

ہر مڑے دار بناتے ہیں غفلت کے مئے

لیکن ذوق آخر ذوق ہے ربتی بن عذرا نہیں۔ اس لئے طفلی اور شباب کو

حسرت سے یاد کرتا ہے

دقتِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

عہد پیری نے بھلا یاد دہڑ چلنا کودنا ہائے طفلی کھیلنا کھانا اچھلنا کودنا

جنت ہے زندگی میں زمانہ شباب کا

پیری ہے پہلے مرگ سے ہونا عذاب کا

جب چراغ کچھ دیر جل چکتا ہے۔ تو اُس کی روشنی زیادہ صفا اور لطیف

ہو جاتی ہے۔ انسان کا فہم و شعور بھی دورانِ حیات میں بتدریج نشوونما پاتا ہے

اور پایاں عمر میں اس قدر ذکاوت حس پیدا کرتا ہے کہ اُس پر زندگی کے اسرار

خود بخود منکشف ہونے لگ جاتے ہیں۔ ذوق نے اس کمال شعور کی دنیا کو

دور سے دیکھا۔ مگر اس کے قریب نہ پہنچ سکا۔ اُس نے عالم کون و فساد پر نظر

ڈالی اور ان حقائق کا ادراک کیا۔

اونچی ہے آشیانہ زراغ و زرغن کی شاخ
ہے صفائی سے سزاوار شکن کا۔ کاغذ
روکیں تو اچھڑ جائے شکم اور زیادہ
اے ذوق اس جہاں کو ہے غربتِ خلقت
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے
اُتراتے یہ گھر اسی جہاں کے لئے ہے
ناامیدی ہو تو پھر انجام کی امید ہے
وہ بلا ہے کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
کہا جانے کیا کرے جو خدا اختیارے
تو زین نہ زرد ہوتی۔ نہ خلک کبوتر ہوتا

بجھلتوں کو کرتا ہے بانا نشیں فلک
بینہ مافوقِ کونے کے ہے ہاتھوں کی شکست
چو بیٹ کے بلے ہیں پچے بات کب ان سے
گہلے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے
جو فائدہ ہستی میں ہے انساں کیلئے ہے
بیقراری کا سبب ہر کام کی امید ہے
موت نے کر دیا لاچار و گردنِ انساں
اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے
جو نہ رنگ رنج و ماتم کا یہاں نمود ہوتا

ہے برا تو بھی اگر آیا نظر تجھ کو برا

تو بھی اچھا ہے۔ تجھے معلوم اگر اچھا ہوا

ان اشعار میں بعض تصوف کے عقاید کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کائنات کا عشق
پر دار و مدار حضراتِ صوفیہ کا مرغوب ترین مضمون ہے۔ ذوق اس عقیدہ میں ان
کے ہنر وادب میں اور ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھتے ہیں۔ کہ آفرینش۔ فضلے نظر گاہ
دور الہی ہے اور بس۔ انسان جاہل ایزدی کا بہترین مظہر ہے۔ اس لئے یہ
کائنات اسی کے لئے تخلیق کی گئی ہے ۵

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست

ہرگز نہ نقطہ ماد و رہفت پر کارست

ناہب کا مقصد اخلاق کی درستی ہے۔ یہ مقصد وہ مختلف قسم کی پابندیوں

سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہراً اپنے نصب العین میں کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ کامیابی ہمیشہ سطحی ہوتی ہے۔ یوں ترقیو کی جکڑ بند سبب ان کو ایک خاص استبداد چلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی سخت گیری اور استبداد منکوس اثر پیدا کر کے ان میں باطنی برائیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ ان باطنی برائیوں میں مبتذل عشق عاشقی سب سے نمایاں ہے۔ غالباً سلاف کی ہوس کاری اور مشقِ مزاجی کا سب سے بڑا سبب یہی مذہب کا استبداد ہے۔ اس کی شدید پابندیوں نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ شاہد پرستی تو کیا امر پرستی اختیار کریں اور اشعار میں غیر فطری عاشقانہ جذبات کے اظہار سے کام لیں۔ ذوق نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اس دریاے کثافت میں شناسداری کی۔ اور خطِ مشکیں، رقیبِ دغلی اور ترکِ مرست کو موضوعِ کلام بنایا۔ فرماتے ہیں۔

آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ دگر نہ جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا
کیا ہوتا جو سمجھاتے اُسے جا کے مرے دوست دشمن کا سخن ذہن نشیں ہو ہی چکا تھا
کہاں دل بھاگ کر جائے کہ تیرے نکل قامتِ عجب اک گرد نامہ خطبے اس مردوں باندھا
ذوقِ عشق و محبت میں انشا اور جرأت کے پہرہ میں۔ اُن کا عشق بھی عشقِ مجازی کی ایک ادنی صورت ہے۔ مومن کے لہجہ میں فرماتے ہیں کہ
جھلکتے تھے ہم انہیں جس روزِ دیوار سے نئے قسمت گھر اسی روز میں ہوزِ جور کا
نزع میں بھی ذوقِ کھیرا ہی بس انتظار جانبِ دردِ دیکھ لے ہے ہوشِ جبِ آج ہے
یاد میں مر جیوں کہ بھول گئے وہ شبِ ماہیت ب کی باتیں؟

بعض اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشق نے ان کے دل کو بعض اوقات بہت ہی ستایا۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ

اگر پوچھے کوئی مجھ سے کہ کیوں نالاں ہے یہ کہہ دوں
 محبت سے۔ محبت سے۔ محبت سے۔ محبت سے۔ محبت سے
 کہیں کہیں یہ عاشقانہ دلوں سے۔ ریخت سے۔ بر خاک چوں دو جام گنجیدہ
 برداشت۔ کامصداق بن گئے ہیں۔ مثلاً۔

گر آج بھی وہ رشک مسحا نہیں آتا
 لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھا مگر
 ہم آپ جل نکھے نگر اس دل کی آگ کو
 غم کو رتری بزم میں کس کا نہیں آتا
 انا تو خفا آتا۔ جانا تو زربانا
 معلوم جو ہوتا ہمیں انجہام محبت
 تھک کو کچھ یاد بھی ہیں پہلی وہ الفت کے مزے
 بے محبت نہیں اسے ذوق شکایت کے مزے
 خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا بچ و تاب میں
 یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
 ہوش و خرد گئے نکلے سحر فن کے ساتھ
 رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل کی شوریہ

جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح
 اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو ایک پاکباز عاشق تصور کرتے ہوئے اپنے
 اختصاص و رابل ہوس کی بے حیثیتی کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

سینے میں بوا ہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
 ہے خوش نصیب عشق میں بوا ہوس وہی
 نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہو گیا
 جس کو کہ غم پہ غم ہو۔ غم پر غم نصیب

ازل سے یوں دل عاشق ہو نور کی قندیل
کہ جیسے عرشِ خدائے مغفور کی قندیل

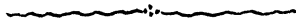
ان عشقیہ اشعار میں شاعر نے اپنے یا عوام الناس کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ پُر تصنع اشعار کی اُس کے یہاں کمی نہیں۔ ذوق کا سارا دیوان انہی پر مشتمل ہے۔ شیخ جیسے زاہد و خشک سے شوخی اور ظرافت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لیکن وہ پھر بھی انشآ اور جرأت کے مقلد ہیں۔ اور مبتذل سفر و استہزاء سے باز نہیں رہ سکتے۔ ان کی ظریفانہ قوت بہت کمزور ہے۔ وہ خندہ پیرا کرنے کی بجائے خود خندہ کا محل بن جاتے ہیں۔ جس طرح شاعر اشیاء کی موافقت اور ارتباط کو بلند ترین مقام پر پہنچاتا ہے، اُس طرح شستہ ظرافت۔ واقعات اور اشیاء کی بے آہنگی اور عدم توازن کو بلند کرتی ہے۔ اگر ظرافت کے اس تصور کو پیش نظر رکھا جائے تو اردو کے بہت کم شاعر اور مصنفین نگار حقیقی دکا ہیہ نگار ثابت ہوں گے۔ ذوق معمولی ہنسی ٹھٹھول پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ بحر شوخی و ظرافت کے خواص نہیں۔ اور زیادہ تر لفظوں سے عجوبگی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ جس کو اعلیٰ ظرافت تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اشعار ذیل جن میں سے بعض پہلے بھی آچکے ہیں شیخ کی ظرافت کی نوعیت ظاہر کرتے ہیں۔

بغل سے لے گئے دل کو نکال کر دھیر	جو بالکا تو کہا آنکھیں نکال کر کیسا
مسواک نے بڑبڑایا ہے زاہد کا اعتبار	یہ بھی ہے اُس کے اک شجرِ کروفن کی شاخ
عمیت تم اپنا رکاوٹ سے منہ بناتے ہو	وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو
گراب کے پھرے جیتے جی کعبہ کے سفر سے	تو جیسا تو پھرے شیخ جی لٹ کے گھر سے
لکائی قلع کو شانے نے اٹھلی تو پکارا دل	یہ گت فی۔ بھلا وہ تو سی۔ لے بے ادب آیا

ہوس میں کعبہ کی کیوں شیخ بتھانے سے گم رہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے وہاں لٹ ہی لٹ ہے

ذوق کے عریضہ اشعار خمدہ یا تبسم پیدا نہیں کرتے۔ ان میں الفاظ کی ظاہری صورت۔ صنایع و بدائع اور محاورات سے تعجب پیدا کرتے کی کوشش کی گئی ہے یہ ایک قسم کی جگت بازی ہے۔ طرافت نہیں۔

ذوق کا شمار اُن لوگوں میں ہے۔ جن کے ملکات و وقت گزرنے کے ساتھ ترقی نہیں کرتے۔ اور اُن کی عادات و خصایل میں تبدیلیاں نہیں پیدا ہوتیں۔ اُن کا مزاج شروع ہی سے عام شاعری کی طرف تھا۔ اور زندگی بھر یہی رہا۔ اُن کے خیالات۔ جذبات۔ مذاق۔ استعمال زبان اور دیگر امور میں کوئی اہم تغیر نہیں ہوا۔ بھلا طفلی میں اُن کی طبیعت کا عقد تشکیل سے ہوا۔ اور وہ عمر بھر اس کے دامن سے وابستہ رہے۔ صلیب اُن کی آنکھوں میں ہمیشہ قہر ہی۔ شیخ کی طبیعت میں ترقی اور نشو و نما کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لئے امتداد و وقت سے اُس میں کوئی خاص تبدیلی نہ پیدا ہوئی۔



پانچواں باب

آرٹ

شعری تصور | شعری تصور سے ہماری مراد وہ اصول یا خصوصیات ہیں جن پر شاعر اپنی شاعری کی بنیاد رکھتا ہے۔ قدیم شعرا عموماً اپنے عقاید شعری کا اظہار نہیں کرتے۔ صرف غالب نے اپنے بعض اشعار میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

خواہش دل ہے زباں کو سب گفت میاں

ہے سخن گرد زردمان ضمیر افشاں

اور اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں کہ

مے فریاد در سخن رنجے کہ بردل مے رسد طوطی آئینہ مامے شود ز نگار

حسن فردغ شمع سخن دور ہے اسد

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

مگر مرزا ملتون کی مانند یہ نہیں کہتے۔ کہ شاعری کو سادہ - محاکاتی اور جوشن میز

ہونا چاہیے۔ ہمیں ان کے عقاید شعری دیگر قدیم شعرا کی مانند ان کی طبیعت اور کلام

کے مطالعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی شاعری ظاہر کرتی ہے کہ آپ فلسفہ

تصوف - معنی نوازی - لطافت اور آپ بیعتی کے دلدادہ ہیں۔ آپ کی غزلیں

ایک خاص طرز کی ہیں۔ مرزا غالب شگفتہ زمینیں۔ مسلسل اضافتیں۔ اچھوتی تہیں تازہ استعدادے۔ اور لطیف ترکیبیں پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک شعریت رنگینی اور دلادیزی شاعری کا بہترین زیور ہیں۔ ان سب باتوں سے ہمیں غالب کا شعری تصور بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ کیا ان کا حریف کمال ذوق بھی اس قسم کا کوئی شعری تصور رکھتا ہے؟ ایسا تصور نہیں جس کو اُس نے سامنے رکھ کر شاعری کی ہو۔ بلکہ وہ جس کی طرف اُس کی ذہنیت اور کلام کی رفتار ہمارے ذہن کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یا ہم خیال کرتے ہیں۔ کہ شیخ نے اُس کو دانستہ طور پر اختیار کیا۔

شاعر کی ذہنیت اُس کے شعری تصور میں بھی ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے ذوق کی شخصیت کے زیرِ عنوان جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تمام ان کے شعری تصور میں شامل ہیں۔ شخصیت۔ سنگلاخ زمینیں محاورہ باز لفظی رعائیتیں۔ ضرب الامثال۔ صنایع و بدائع اور دیگر فارسی خصوصیات ظاہر کرتی ہیں۔ کہ ذوق کے شعری تصور میں صورت کا جز و معنی کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

آزاد مرحوم نے دہسیات میں ایک نہایت مفید اطلاع ہم پہنچائی ہے جس سے ذوق کی ذہنیت اور شاعرانہ اصولوں پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ آپ قلم گستر ہیں

بعض نقاد ذوق کی مدافعت میں استدلال کرتے ہیں کہ ان سے چند ایک زمینوں میں بے احتیاطی کے باعث لغزش ہو گئی ہے ورنہ وہ عام طور پر شگفتہ زمینوں میں شعر کہتے ہیں۔ یہ رائے درست نہیں۔ شیخ اس قسم کی ناگوار زمینیں عدا اختیار کرتے ہیں۔

یہ بھی آپ ہی فرماتے تھے۔ کہ ان دنوں ہمارا عالم ہی اور تھا۔ جوانی دوانی۔ ہم کبھی جراث کے رنگ میں۔ کبھی سودا کے انداز میں شعر کہتے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے ان دنوں مر کے ہو رہے تھے۔ اُن کا ڈھنگ وہی تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ علاوہ ازیں مرزا کی طرز کو جلد سے گمانے اور لوگوں کے لب و دہن سے واہ واہ کے نکال لینے میں جادو کا اثر ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں جہت بندشیں۔ برجستہ ترکیبیں۔ معانی کی بلندی۔ الفاظ کی شکو میں ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الہی بخش خاں معروف کی خدمت میں دو عہد کے دربار میں پہنچے۔ معروف کی پسند طبع کے بموجب تصوف اور عرفاں اور درود دلی کی طرف خیالات کو مایل کرنا پڑا۔ نوجوان ولیعہد، جراث کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور جراث سے انشا مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنے سے اکثر آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں اُنہی کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اُن کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوف کے۔ دو تین معاملے کے اور ہرچ اُس میں یہ ہوتا تھا۔ کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت لکھتا تھا۔ پس وہ مشتاق با کمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔ اور اس طرح باندھتا تھا۔ کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انہی اصول کے لحاظ سے میر۔ درد۔ مرزا۔ مصحفی۔ انشا۔ جراث بلکہ تمام مقتدین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے۔ گویا انہی کے شاگرد ہیں۔ پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ اصلی میلان طبع اُن کی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہنچاتے تھے۔ اور

مضامین کے طیب تھے۔ جس طرح برجستہ بیٹھنا دیکھتے تھے۔ اُسی طرح باندھ دیتے تھے۔ خیال بندی ہو یا عاشقانہ یا تصوف۔ اُن کے سینے میں جو دل تھا۔ گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل تھے۔ دل کا خیال باندھتے اور اس طرح باندھتے تھے۔ گویا اپنے ہی دل پر گزری ہے۔“

آزاد نے یہاں ذوق کی تمام شاعرانہ کارپردازی اور اصولوں کا راز فاش کر دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ذوق نے شاعری کی بنیاد ظاہری صورت پر رکھی۔ معنوی امور کا اُن کو دہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ جذبات و عقاید کی ترجمانی کو شاعری نہیں خیال کرتے۔ بلکہ رنگ و رنگ کے مضامین باندھ کر مقبولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صدقِ اخبار کے اساسی اصول کے خلاف چلتے ہیں۔ تصوف۔ فلسفہ۔ و قوغ گوئی جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہتے۔ کہ اُن کی طبیعت ان کو پسند کرتی ہے۔ بلکہ اُن کو ہر قسم کے لوگوں کی تالیفِ قلوب مقصود ہے۔ یعنی شیخ کا مطمح نظر جامعیت ہے۔ اُن کی غزلیں آزاد کی روایتوں کی تصدیق کرتی ہیں۔ جنہوں نے متعدد بار ذوق کے شاعرانہ اصولوں کی توضیح کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

”ایک شاعر میاں شہید سی۔ اس زمانہ میں دلی آیا۔ اُس نے چمن کی شاخ یا سمن کی شاخ۔ ایک غزل پڑھی۔ خان موصوف نے اسنادِ مرحوم سے کہا۔ انہوں نے اس غزل پر ایک بڑی سیر قافی غزل کہی۔ اور یہ بھی کہا۔ کہ اب جو کوئی اس طرح میں غزل کہے گا۔ ہر ایک قافیہ کو جس جس پہلو سے میں نے باندھ دیا ہے۔ اُس سے الگ کر کے نہ باندھ سکے گا۔“

اس ذاتی اعتراف سے جس کے لئے ہمارے خارجی و داخلی ثواب موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذوق کے شعری تصور میں قافیہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس بات کی تکرار تو مرثعاً غیر ضروری ہے۔ کہ جامعیت، شیخ کے شعری نظریہ کا جزو اعظم بلکہ جزو لا ینفک ہے۔ وہ غزل لکھتے ہیں تو پہلے اُن مضامین کو سامنے رکھ لیتے ہیں۔ جن کو وہ قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مضامین لازماً متفرق قسم کے ہیں۔ کیونکہ شاعر کی کوشش یہی ہے۔ کہ اُس کو ہر طبقہ اور ہر قسم کے لوگوں میں مرجعیت حاصل ہو۔ ذوق کے اشعار میں زیادہ تعداد اُن اشعار کی ہے۔ جن میں اُنہوں نے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے لفظی تلازمات اور خیالی مضامین نظم کئے۔ اُن کے بہت سے مضامین پہلے ہی سے مژر ہیں۔ اور وہ اُن کو ہر غزل میں حقو طوی بہت تبدیلی الفاظ۔ اور تخیل کے ساتھ ہمارے شعر میں ببوس کر دیتے ہیں۔ شاہ نصیر کے فرزند میر کا یہ طعن آمیز شعر

گرچہ قندیل سخن کو مسدھ لیا تو نے تو کیا
ڈٹائیچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیا

حقیقت پر مبنی ہے :

ذوق کے معین مضامین کیا ہیں۔ جن کو وہ بار بار نظم کرتے ہیں ؟ و حشت - جنوں۔ صحر اگردی۔ گریبان کا چاک ہونا۔ گریہ۔ معشوق کی شانِ مہیادی، بجوم غم۔ مول شبِ فراق۔ فرضی عشق عاشقی کے مجازی مضامین۔ اور دیگر پیش پانودہ خیانات۔ یہ رسمی مضامین ذوق اور دیگر قدیم شعرا کے یہاں مابہ الا شراک ہیں۔ شیخ اُن کو ایسے الفاظ اور انداز میں قلمبند کرتے ہیں۔ جو انہی سے مخصوص ہے۔ آپ کی ایک غزل کے مضامین بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ان سے آپ کے عام

خیالات کی نوعیت ظاہر ہو جائے گی ۔
 شمع اس بات پر فخر نہ کرے ۔ کہ اس کی آنکھ سے ایک رات گرم آنسو بہے ۔
 ہماری آنکھ سے برسوں گرم ہو رہا ہے
 اے آتش غم تو بھی میسر دل کو کس قدر گرم کرتی ہے ۔ کہ جب میرا ہلوزمین پر
 لگتا ہے ۔ تو وہ پشتِ سمک تک گرم ہو جاتی ہے ۔
 جب ہم نے تمہارا بوسہ لیا اور تم برہم ہو گئے ۔ تو ہمیں اس کا لطف نہ آیا ۔
 اے شعلہِ خوشحبيب ۔ تو نے ہمیں شربتِ قند بھی دیا تو گرم کر کے دیا ۔
 اگر میرا بدن یونہی تب غم سے گرم رہا ۔ تو میرے بدن پر بالِ سبج آہن
 کی طرح گرم ہو جائیٹ گے ۔
 نثر میرا خون نکالتا ہے ۔ لیکن چونکہ برابر نہایت گرم ہے ۔ اس لئے میں
 ڈرتا ہوں کہ بشرِ کشتہٴ فولاد کی طرح جل کر خاک نہ ہو جائے ۔
 صیبِ محبت کا قاتل سے گلہ نہ کرے سکا ۔ اگرچہ اُس نے جاقو کو
 پتھر پر اس قدر رگڑا ۔ کہ وہ گرم ہو گیا ۔

ہم تو ہمیشہ سنتے آئے ہیں ۔ کہ سب ترش چیزیں ٹھنڈی ہوتی ہیں ۔
 اے ذوقِ میرا محبوب ترش آبرو ہو کر بھی شعلہٴ مزاج کیوں ہے ؟
 چونکہ ذوقِ ایک ہرگز نیرِ شاہِ ہنر چاہتے ہیں اور اُن کو مختلف قسم کے مضامین
 قلمبند کرنے پڑتے ہیں ۔ اسلئے اُن کی غزل عموماً طوفانی ہوتی ہے ۔ وہ صرف
 لکھنے کے نتیجے میں ایسی غزلیں نہیں کہتے ۔ بلکہ عوام و خواص میں مقبول ہونے لے
 لئے اُن کو مجبوراً طویل غزلیں لکھنی پڑتی ہیں ۔ مضامین کے ساتھ اُن کو ہر قسم
 کے محاورات ۔ کہاوتیں ۔ اور قافیے نبھانے کی ضرورت ہے ۔ وہ اپنے کلام
 میں ہر نامور مقبول عام شاعر کا رنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ ان سب باتوں

کی وجہ سے اُن کو نہ صرف لمبی غزلیں کہنے کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ اکثر دو غزلوں تک بھی ذہن پہنچتی ہے۔ مختصر یہ کہ طوالت ذوق کے شعری تصویلاً میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

ذوقِ انہی اصولوں پر چلتے ہیں۔ جو دیر سے مستند چلے آتے ہیں۔ وہ محاصل اور اصول فن کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ قدما کا ہر لفظ اُن کے لئے دفتر سخن کی ہر ہے۔ جو کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی۔ جس جس طرح اساتذہ نے کوئی بات کی ہے۔ اور بنائے زمانہ پسند کرتے ہیں۔ وہ اُس سے کبھی انحراف نہیں کرتے۔ اُن کا شعری تصور یہ ہے۔ کہ وہ ایک مسلم دستور العمل پر سختی سے کار بند رہیں۔ اور اپنی طرف سے کوئی اجتہاد یا تصرف نہ کریں۔ ذوقِ زبان اور بیان کے تمام اصولوں کو سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں۔ چنانچہ غزل میں پہلے دو تین بلکہ جتنے شعر چاہو۔ حسنِ مطلع بنائے جاسکتے ہیں۔ چونکہ شاعری کے قانون ہاندھنے والوں نے اس کو بڑھانے کی اجازت دے دی ہے۔ اس لئے عام اس سے کے یہ موزوں ہوں یا غیر موزوں۔ ذوقِ ضابطہ کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور اُن کے تعدد سے پرہیز نہیں کرتے۔

شعرا کو یہ بھی اجازت ہے۔ کہ وہ قافیہ کی تصنیف کریں۔ ذوقِ اس اصول پر بھی عامل ہیں۔ اور بلا لحاظ موزونیت۔ قافیہ کا گر بیان پاک کر دیتے ہیں۔ ہم نہ کہتے تھے کہ ذوقِ اُس کی تو زلفوں کو نہ چھیڑ

اب وہ ہم سے تو ہے تجھ کو قساق یا ہم کو
قدیم شاعری میں ابطائے خفی و جلی۔ تعدی۔ غلو اور اس قسم کے چند اور
قافیوں کو معیوب قرار دیا گیا ہے۔ ذوقِ ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں

لیکن جن قوانین کے متعلق اصول فن کے واضعین نے کوئی قانون نہیں باندھا وہ ان کی غیر موزونیت کی پروا نہیں کرتے۔ اور ہر قسم کے ناگوار قافیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً نمک چش۔ عیش عیش۔ کھیکڑ۔ سکیڑ۔ اُدھیڑ اور ہرن کا کاغذ۔ شکن کا کاغذ وغیرہ۔ اگر شاعر اصولوں کی بجائے ذوقِ سلیم کی پیروی کرتا۔ تو ان غیر موزوں قافیوں کو ہرگز استعمال نہ کرتا۔

ذوقِ مذاق عامہ کا اتباع کرتے ہیں۔ اس لئے وہ زیادہ تر عوام ہی کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ کی طبیعت اُس قسم کی غریب پسند کرتی ہے۔ جو مبتذل جذبات کی ترجمانی کریں۔ اور تیار ہوتے ہی عام الناس کے زبان زد ہو جائیں۔ ذوقِ کمال کے شعراءِ سخاقت جزوِ اعظم ہے۔ خواہ وہ اس کو عہد پیدا کرتے ہیں۔ خواہ نہ ہوں۔ بعض نقاد شاعر کی مدافعت میں کہتے ہیں۔ کہ وہ طبعی سن اور اکبر الہ آبادی کی مانند لسانِ العصر ہے۔ اُس نے ان دونوں باکمالوں کی طرح اپنے زمانے کے مذاق اور حالات کے مطابق شاعری کی۔ اس لئے ہم اُس پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ استدلال درست نہیں۔ لسانِ العصر ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر کوئی شاعر اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق ایسی شاعری اختیار کرتا ہے۔ جو معیارِ سخن پر پوری نہیں اُترتی تو ظاہر ہے۔ کہ وہ ایک حقیقی شاعر نہیں۔ بھری محال اگر شیخ 'لسانِ العصر' کہلانے کے سستی ہوں پھر بھی اُن کی عظمت تسلیم کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی اپنے عہد کا ترجمان ہونے کی بجائے شاعر کو اپنی طبیعت کا ترجمان ہونا چاہیے

لہٰذا یہ مثالیں شاعر کے طریقِ غزلگوئی سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔ ناظرین ان کو آسانی سے دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں۔

اگر وہ اس کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا ہے۔ تو اس کی عظمت مسلم۔ لیکن اگر وہ ذوق کی مانند خیالی مضامین قلمبند کرتا ہے۔ تو اس کا نام جریدہ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت نہیں ہو سکتا +

طریق غزلگوئی

ایک فاضل نقاد نے ذوق کا طریق غزلگوئی بہت اچھی طرح واضح کیا ہے۔ اس پر حاشیہ آرائی کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس لئے ہم آپ کی تحقیق کے نتائج کو حذف و اختصار کے بعد سطور ذیل میں پیش کرتے ہیں +

I

۱) عام قاعدہ ہے کہ جب غزلگو شرعاً شعر کہتے ہیں۔ تو پہلے شعر کا وہ مصرع ان کے خیال میں آتا ہے۔ جس میں قافیہ یا قافیہ کے ساتھ ردیف بھی ہو۔ ذوق کی غزلگوئی کا عام دستور یہ ہے۔ کہ اگر قافیہ در ردیف میں کوئی فعلی جز ہو۔ تو اس فعل کے ساتھ مختلف الفاظ ملانے سے جتنے محاورے پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ حتی الامکان ان تمام محاوروں کو باندھ جاتا ہے۔ مثلاً ایک غزل کی زمین ہے قدم اٹھ نہیں سکتا۔ قلم اٹھ نہیں سکتا۔ اس میں ذوق نے حسب ذیل محاورا باندھے ہیں :-

ستم اٹھنا۔ حرف اٹھنا۔ پردہ اٹھنا۔ فائدہ اٹھنا +

ایک غزل کی ردیف ہے۔ بکھا ہوا۔ اس میں بکھا ہوا پانی۔ دل بکھنا زہر میں بکھا ہوا میچ۔ بندوق کا بکھا ہوا توڑا وغیرہ محاورات باندھے ہیں ... غرض ایسی غزلوں میں جن کی زمین میں کوئی فعلی جز ہو یا کسی فعل کا کوئی مشتق ہو۔ ذوق کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے۔ کہ اس فعل کے ساتھ مختلف

لہذا سارا ردو کے ایک گننام نقاد معہ قارئین اس قسم کی دیگر ملاحظات بہ اس فی تلاش کر سکتے ہیں۔ سلسلے باقیہ اندہ مثالوں کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے +

الفاظ کے ملانے سے جو محاورے پیدا ہوئے ہیں۔ اُن سب کو یا اُن میں سے اکثر کو باندھ دیا جائے۔ اگر ظفر کے چاروں دیوان کھیل کر دیکھے جائیں۔ تو اُن میں بھی یہی انداز برابر پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ کہ ذوق اور ظفر دونوں کا میلان خاطر اس طرف تھا۔ کہ زبان کے عام محاورے شاعری میں روشناس کئے جائیں۔ خیالات کی جدت یا بلندی کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔

(۲) غزلوں میں بھی جن کی ردیف و قافیہ میں کوئی فعلی جز نہیں ہے۔ ذوق کا میلان اس بات کی طرف ہے کہ عام بول چال کو شاعری سے روشناس کیا جائے۔ مثلاً ذیل کے مصرعوں کو ملاحظہ کیجئے:-

جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تباہ ہو گیا دیکھے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا
اے فلک گرستے تجھے اچانک سنا دیتا یہن کر جامہ بھی آئے وہ اگر قرآن کا

وغیرہ وغیرہ

II

سنگلاخ زمین میں مددِ یف ایسی رکھی جاتی ہے۔ کہ قافیہ سے اس کا جوڑ ملانا مشکل ہو جائے۔ اگر شاعری میں خیالات کا روانی سے ادا کرنا مقصود ہو۔ جیسا کہ فی الحقیقت ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ کوئی خیال ایسی زمین میں تکلفی اور روانی سے ادا نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں لمبی لمبی نظموں کے لئے قافیہ کی قید

لے ظفر ذوق کی ہنرت بہت کم محاورات استعمال کرتا ہے

اٹھادی گئی ہے۔ تاکہ خیالات برستی اور آسانی سے ادا ہو سکیں۔ ہمارے یہاں قافیہ کی قید لازمی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر قافیہ کے ساتھ ردیف بھی ہو تو ایسی زمینیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ سنگلاخ زمینیں اختیار کرنے والوں نے اس پر اور ستم ڈھایا کہ ردیفیں ایسی پسند کیں۔ جن کے ساتھ قافیے مشکل سے جڑ سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس لزوم مانا یلزم میں شاعر کی طبیعت کس قدر رُک جاتی ہے۔ اور وہ جن خیالات و جذبات کو ادا کرنا چاہے۔ اُن کو ادا کرنے میں اُس کو کتنی دشواری پیش آتی ہے۔ عام طور پر ایسی زمینیں اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ شاعری تک بندی کا نام ہو گیا ہے۔ اور غزل گوئی اپنے مقصد سے کوسوں دُور ہٹ گئی ہے۔ ذوق نے سنگلاخ زمینوں میں اکثر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی چند مثالیں یہ ہیں۔

گدائی کا جھوٹا۔ رسائی کا جھوٹا	سامں میں لوٹتا۔ منزل میں لوٹتا
پتھر زیر پا۔ اختر زیر پا	جرس جام شراب۔ گیس جام شراب
بے قسار پشت۔ داغدار پشت	دہن کی شاخ۔ کفن کی شاخ

دیخو و غیرہ۔

III

وہ زمینیں جو نہ تو سنگلاخ ہیں اور نہ اُن میں کوئی فعلی جز ہے۔ اُن میں ذوق کا دماغ کس طرح کام کرتا ہے۔ ابھی بحث طلب ہے۔ ذوق اور قالب دونوں کے دیوان سامنے رکھئے۔ ایک ہی زمین کی غزلیں دونوں میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ جن غزلوں میں (کا) یا (دیں) یا (کو) یا (سہما) جو گوگ مشنوی میں ردیف پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اُن کو یہ سطور توجہ سے پڑھنی چاہئیں۔

جیسی چھوٹی ردیفیں ہیں۔ ان میں شاعر کو قافیہ ہی پر طبع آزمائی کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ ردیف لمبی نہیں ہے۔ اور ردیف سے کوئی مدد شاعر کو خیال دوڑانے میں نہیں مل سکتی۔ اس لئے رفتاری خیال میں ہر شاعر کا دماغ آزاد ہے۔ پھر جس کا جو میدان طبع ہے وہ ایسی زمینوں میں صاف نمایاں ہو جاتا ہے۔

غالب کی ایک غزل میں ردیف رکھا ہے۔ دریاں • زنداں وغیرہ فائزے اختیار کئے گئے ہیں۔ اس زمین میں غالب کو لسیان کا قافیہ باندھنا منظور تھا۔ لسیان سے طاق لسیان کی طرف خیال گیا۔ اگر اس کے بعد ردیف دہرایا ہوتا تو غالب آزمائی سے کسی چیز کو طاق لسیان پر رکھ کر بھول جاتے۔ مگر یہاں ردیف رکھا ہے۔ طاق نے گلدستہ کا لفظ فوراً سمجھایا اور ایک نیا خیال ہاتھ آیا۔ مگر وہ کیا چیز ہے۔ جو طاق لسیان میں گلدستہ بنا کر رکھی جائے؟ غالب اپنی بلند جانی سے جنت کا وجود ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کو خدا کی فائزے ورے ریا عبادت میں فحش انداز جانتے ہیں۔ جب گلدستہ سے جنت کی طرف خیال گیا۔ تو غالب کو موقع مل گیا۔ کہ وہ جنت کی نسبت اپنے بلند خیال کو ظاہر کریں۔ مگر جنت کا لفظ اس مصرع میں کھپ نہیں سکتا۔ گلدستہ اور طاق لسیان کے الفاظ نے بہت جگہ گھیرنی ہے۔ مجبوراً اس لفظ کو پہلے مصرع کے لئے رکھ چھوڑا۔ اس طرح لفظ سے لفظ اور خیال سے خیال تک پہنچتے پہنچتے مطلع کا سامان ہو گیا۔ اور ایک شعر بنا جس میں فلسفہ عبادت کے متعلق ایک گہرا خیال بنائیت دلکش الفاظ میں ادا ہو گیا۔

ذوق کا ذہن بلند مضامین کی طرف نہیں جاتا۔ ایک زمین ہے۔ ایمان کا سامان کا۔ اول شیطان کا قافیہ خیال میں آیا۔ اس قافیے سے فوراً اس کا ذہن عام لوگوں کے اس مقولے کی طرف گیا۔ کہ جلدی کرنا شیطان کا کام

ہے۔ دوسرا مصرع نہایت آسانی سے بن گیا۔ کہ 'دل نہ کر جلدی کہ جلدی
 کام ہے شیطان کا، شیطان دشمن ایمان ہے۔ اس لئے پہلے مصرع کے
 لئے دشمن ایمان کا مناسب لفظ مل گیا۔ مگر دشمن ایمان درکار کے الفاظ
 سے شاعر محبوب کی ذات مراد لیتے ہیں۔ اس لئے پہلا مصرع بھی آسانی
 سے تیار ہو گیا کہ 'ہونا عاشق جان کر اُس دشمن ایمان کا، مطلع کا مطلع بن
 گیا اور ایک عام خیال بھی بے تکلف ادا ہو گیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ قافیہ سو جھننے کے ساتھ ذوق کا خیال کسی
 محاورہ کی طرف جاتا ہے۔ یا تناسب الفاظ اور مشہور تشبیہوں کی طرف منتقل
 ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ کسی عام اور معمولی خیال کو بے تکلف اور آسانی
 سے ادا کر جاتا ہے۔ برخلاف اس کے غالب کے خیال میں جب کوئی قافیہ
 آتا ہے۔ تو وہ زبان اور محاورہ کے پہلو کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ کسی اچھوتی
 نفسی کیفیت کو شکار کرتا ہے۔ اس موازنہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب کس قسم
 کے مضامین اپنی شاعری میں باندھتا ہے۔ اور ذوق کس قسم کے۔ ذوق کی غزلیں
 آپ کے سامنے ہیں۔ ان کا غالب کی اس غزل کے ساتھ موازنہ کیجئے۔

آزاد لوگوں کو کسی غم یا صدمہ کا احساس زیادہ دیر تک نہیں رہتا۔ وہ اپنے
 ماتم خانہ کی شمع برق سے روشن کرتے ہیں۔ وجوہت جلد فنا ہو جاتی ہے،
 ہمارا خیال پرانی محفلوں کا تصور باندھتا ہے۔ اس لئے ہماری نظروں
 کے سامنے ایک تنجانہ کاحیرت فراطلسم ہے۔

اس عظیم شور و شر اور ہنگامہ کے باوجود ہم موجود نہیں۔ گویا ہم بہ روشنی
 میں جو پروانے کے دل کے شبستاں میں جلوہ گر ہے اور خارج میں کوئی
 وجود نہیں رکھتی۔

ہماری ترکِ جستجو قناعت سے نہیں بلکہ ضعف سے ہے۔ اس لئے ہم اپنی ہمت مردانہ کے لئے باعثِ انفعال ہیں۔
اے استاد ہمارے دل میں لاکھوں تنائیں محبوبس ہیں۔ اس لئے ہمارا دل ایک قسم کا زنداں ہے۔

ظاہر ہے کہ ذوق کی غزل کے مضامین غزلیت سے کس قدر دور ہیں۔ غالب کی غزل نہایت سنجیدہ اور معقول مضامین پر مشتمل ہے۔ جہاں تک ذوق اور غالب کی ذہنی رفتار کا تعلق ہے۔ ہم حضرت نقاد کی راؤں سے کئی اتفاق رکھتے ہیں۔ لیکن آپ کی بعض تصریحات کی درستی میں ہمیں شک ہے۔ مرزا غالب ہمیشہ بلند خیالات کی طرف نہیں جاتے ان کے بہت سے اشعار پُر تصنع ہیں۔ ہم ان کی مدافعت میں دلائل پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا سارے کا سارا کلام بے عیب اور بلند پایہ ہے۔ اگر ان کے اکثر اشعار کو اعلیٰ قرار دیا جائے۔ تو ہمارے خیال میں یہ ان کی شاعری کی صحیح کیفیت ظاہر کرے گا۔

یہ خیال غلط ہے کہ جب غزلگو شاعر شعر کہتے ہیں۔ تو پہلے ان کے خیال میں شعر کا وہ مصرع آتا ہے جس میں قافیہ یا قافیہ کے ساتھ ردیف بھی ہو اور یہ کہ شعر کا مضمون فکرِ شاعر کے ایک لفظ سے دوسرے لفظ کی طرف منتقل ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی خیال حالی۔ شبلی۔ طباطبائی اور دیگر ناقدانِ فن نے ظاہر کیا ہے۔ لیکن وہ سب کے سب قدیم درسگاہوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور جدید نقاد ہونے کے باوجود شاعری کی ظاہری خصوصیتوں سے زیادہ انوس تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم شعرا قافیہ ہی سے مضمون پیدا کرتے ہیں۔ مگر بندش کا جو طریقہ ہمارے نقاد بتاتے ہیں۔ وہ سرِ قافیہ غلط

اور ناقابل عمل ہے۔ اگر ذہن اُسی طرح لفظ تا لفظ پہنچتا ہے جس طرح نقاد حضرات بیان کرتے ہیں۔ تو بدیہاً ایک غزل کے تیار ہونے کے لئے عمر خضر سے بھی زیادہ عرصہ درکار ہے۔ مجموعہ خیال فرد فرد ہو تو غزل کے نسخہ کی تالیف ناممکن ہے۔ شاید غیر حقیقی شاعر الفاظ کو جمع کر کے سادک نظم میں لاتے ہوں۔ کیونکہ وہ عقل و شعور کی مدد سے شعر کہتے ہیں۔ لیکن حقیقی شاعروں کا تخیل تمام مرحلوں کو ایک ہی قدم میں طے کر لیتا ہے۔ بالفرض خیال قافیہ ہی سے سوجھے پھر بھی وہ نظم کرتے وقت لفظوں کے ساتھ ٹھو کریں نہیں کھاتے پھرتے۔ بلکہ تخیل کی مدد سے بلا تصف مضمون کو ادا کر دیتے ہیں۔ اُن کے اشعار افسانہ کے محلات کی مانند دم زدن میں پیدا ہوتے ہیں۔ عام تعمیرات کی مانند آہستہ آہستہ پتھروں اور اینٹوں کے چننا وے سے تیار نہیں ہوتے۔ شاعر بھی شعر کہتے ہیں۔ تو خیال ہی کو پیش نظر رکھ کر کہتے ہیں۔ کیونکہ الفاظ تلاش کر کے شعر مرتب کرنا بیستوں سے جوئے شیر بہانے کے مرادف ہے۔ ذوق اور غالب کے ہمیش کردہ اشعار سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایک کے ذہن میں قافیہ (اگر خیال واقعی قافیہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں) سے بلند خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسرے کا تخیل معمولی باتوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ دونوں اپنے مذاق کے مطابق اسلوب بیان اور زبان تلاش کرتے ہیں۔

بلند پایہ شاعر قافیہ سے مضمون نہیں پیدا کرتے۔ قافیہ سے مضمون پیدا کرنے کا نظریہ شاعری کی صحیح تعریف کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس میں جذبات اور خیالات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اصل یہ ہے۔ کہ اعلیٰ اور حقیقی شاعروں کے ذہن میں پہلے ہی سے خیالات اور افکار کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ وہ دبا دبا نہ چکیدن سرنگوں ہوتا ہے۔ ہوا کی ذرا سی تحریک اُس کو پختہ شریکی

مانند شاخ سے علیحدہ کر دیتی ہے جب شاعر غزل میں موزوں قافیہ دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو مناسب الفاظ میں قلمبند کر دیتے ہیں۔ بندش کے لئے الفاظ تلاش کرنا اور بات ہے۔ اُن کے لئے ہر صتلع کو غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن یہ غور و فکر بھی اس قسم کا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہمارے نقاد خیال کرتے ہیں۔ تخیل نہایت سرعت سے موزوں پیرایہ اور الفاظ پیدا کرتا ہے۔ غیر حقیقی شاعروں کے عقل و فہم کی مانند اُن کی جستجو نہیں کرتا۔ غرض طریق غزل گوئی کے متعلق ہمارے نقادوں کے جس قدر مفروضات ہیں۔ نااستوار بلکہ نادرست ہیں ذوق جیسا شاعر شاید قافیہ سے مضمون پیدا کرے۔ حافظہ اور عرق اس کی مدد سے بے نیاز ہیں۔

رسالہ اردو کے مذکورہ بالا گناہ نقاد کی پیش کردہ مثالوں سے صرف شاعروں کی ذہنیت معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے تخیل پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اگر مرزا غالب نے ایک اعلیٰ خیال کا ادراک کیا تو یہ اُس کے بلند مذاق اور خلعتان فرہنگ کا لطیف ثمر ہے۔ تخیل کی پیداوار نہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ ایک حد تک تخیل بھی اعلیٰ اسالیب اور مضامین معرض وجود میں لاتا ہے۔ لیکن اس کا اصلی کام تھوڑات کی تخلیق ہے۔ ذوق میں اس قسم کے محسوسات اور تصدیقات کے مشاہدہ کی قوت نہیں۔

ایک ہی ردیف یا مشابہ زمینوں کی غزلیات کا موازنہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کسی شاعر کی کوئی غزل لے لیجئے۔ اس سے اُس کی دماغی رفعت اور طبیعت کا انداز معلوم ہو جائے گا۔

اگر ذوق کا نام آج تک زندہ ہے۔ اور بعض لوگ اب بھی **زبان** اُن کے مداح ہیں۔ تو اس کی وجہ اُن کی ہا محاورہ زبان ہے۔

ذوق کی شاعری میں ہزار بانقاٹھ بتائے جائیں۔ پھر بھی ذوق کے مدارج کہتے ہیں۔ کہ وہ ایک بڑے شاعر ہیں۔ کیونکہ اُن کی زبان سادہ اور با محاورہ ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سند کہتے ہیں۔ اُن کی زبان دہلی کی مستند اردو ہے۔ وہ زبان دہلی میں اپنا جواب آپ ہیں۔ رسالہ ٹکڑ میں ایک نقاد اس نقطہ خیال کی یوں ترجمانی کرتا ہے:-

”غزل میں عالمانہ الفاظ، لکھنا فن سخنوری میں جائز نہیں ہے۔ روزمرہ کی عصفائی سلاست الفاظ اور ملائم تشبیہیں غزل نگاری کی رُوح ہیں۔ میر تقی مرحوم کا شعر ہے

یوں پکائے ہیں مجھے کوچہ جاناں والے

ادھر آجے ابے اوچاک گریباں والے

الفاظ سو قیام ہیں۔ لیکن درد بھردیا ہے۔ اور موقع کی تصویر کھینچ دی ہے۔ حالانکہ ذوق مرحوم کے یہاں ایسے الفاظ نام کو بھی نہیں ہیں۔ میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں مان سکتا کہ ان کا سو قیام دراز ہے۔ ان کی زبان اردو معنی ہے۔ وہ خاص قلم کی زبان ہے۔ وہ زبان ہے جس کے واسطے صحافی لوگوں کو ازراہ طنز کہا کرتے تھے۔ کہ جن لوگوں کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا وہ ریختہ کیا جانیں گے۔ یہ وہ زبان ہے جس کی انہوں نے ایک دہلوی ماں کی آغوش سے ابتدا کی۔ اور جس کو امرائے صحبت میں نشوونما دی۔ ۵۸۰ برس مشرق سخن کی۔ تہی بیسویں صاحب دیوان کر دیا۔ نواب ابی بخش خاں مرحوم کے استاد رہے۔ اُن کو صاحب دیوان معروف کر دیا۔ ہمہ داس۔ ہمہ گیر کاظمین دہلی کی آنکھیں دیکھیں۔ ایک شخص محمد حسین نامی کو آغوش تربیت میں لیا۔ جو بڑا ہو کر یہ پردان چڑھا کہ اردو سئے معلّے کا نثار بیعدیل ہو گیا۔ پھر

کسی کو کوئی حق نہیں کہ ذوق کی زبان پر اعتراض کرے۔ جناب اس زبان کو ایسی رمانے کے اہل کمال کے نقطہ نظر سے دیکھئے۔ ان کے مویدین اہل فضل کے نقطہ نظر سے دیکھئے۔ آزاد اور حالی اور فضل حق مرحوم کی نظر سے دیکھئے۔ آپ اس زبان کا مقابلہ ستر برس بعد کی زبان سے نہ کیجئے۔ رہا یہ کہ سو قیاد مضامین ہیں۔ کم از کم کچھ مثالیں تو اس سو قیاد شاعری کی پیش کرتے؟

یہ تنقید ایک اور نقاد کے جواب میں ہے۔ جس نے یہ کہنے کی جرات کی کہ ذوق کا کلام سہل الفہم ضرور ہے۔ مگر اس میں وہ شگفتگی اور رنگینی نہیں جو ایک عامی اور عالم کے یہاں مابہ الامتیاز ہے؟

جنبہ داری کی بات اور ہے۔ لیکن تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے تو عرض نہایت معقول ہے۔ معترض کی مراد لفظ 'عالم' سے وہ انسان نہیں جو دقیقہ الفاظ استعمال کرتے ہیں، بلکہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو علم و فضل کے ساتھ صاحب ذوق بھی ہیں۔ وہ عام الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، تو ان میں لطافت پیدا کرتے ہیں۔ اور کوئی مشکل لفظ نظم کرتے ہیں۔ تو وہ بھی شعر کے حسن اور اثر میں اضافہ کرتا ہے۔ عالم کا لفظ 'عامی' کے مقابلہ میں لایا گیا ہے۔ تاکہ نقاد کا مفہوم اچھی طرح ظاہر ہو جائے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔ کہ تنقید نگار مشکل اور دقیق الفاظ کے استعمال کو شاعری کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ وہ تو صریحاً فصیح اور لطیف الفاظ برتنے کا حامی ہے۔

ہم نے اصول تنقید کے زیر عنوان ثابت کیا ہے۔ کہ کلام کا سہل ہونا اور بات ہے۔ سادہ ہونا کچھ اور۔ ایک سہل غیر متمنع ہے۔ تو دوسرا سہل متمنع۔ ان دونوں باتوں میں جو نازک فرق ہے۔ محتاج بیان نہیں۔ سہل متمنع فصاحت و بلاغت کے بہترین استخراج کا نام ہے۔ یعنی اس میں سادگی

اپنے تمام لوازمات کے ساتھ موجود ہونی چاہئے۔ ذوق کے کلام میں ایسے شعروں کی تعداد بہت کم ہے۔ جن کو صحیح معنوں میں سادہ کہا جاسکے۔ اور غالباً کوئی شعر ایسا نہیں جس کی معنوی وسعت تخیل کی انتہائی پرواز یا کمال بلاغت کا پتہ دے۔ ذوق کے اچھے شعر بلندی کی ایک خاص حد تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ ان اشعار کو چھوڑ کر جن کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ ذوق کے تمام کلام کے متعلق بلاخوف مبالغہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ سہل ہو تو ہو۔ سہل مستع اور برگزیدہ نہیں۔ غزل میں عالمانہ الفاظ لکھنا فن سخنوری میں جائز نہیں ہے؛ اس فقرے میں لفظ 'غزل' کو نہایت محدود معنوں میں لیا گیا ہے۔ بہتر تھا کہ یہاں تغزل کا لفظ استعمال کیا جاتا۔ جو نقاد کے مفہوم کو زیادہ وضاحت سے ادا کرتا ہے۔ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ کہ غزل اب ایک تار کا ساز نہیں رہی۔ بلکہ متعدد نواؤں کا رباب بن گئی ہے۔ یہ محض حرف زدن بہ زناں یا عاشقانہ جذبات سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ انواع و اقسام کے مضامین ادا کرتی ہے۔ اگر تغزل محض مقصود شعر ہے۔ تو اس کے لئے عالمانہ الفاظ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر غزل میں حکیمانہ۔ مقصوفانہ۔ سیاسی۔ ہر قسم کے مطالب و معانی ادا کئے جاتے ہیں۔ تو عالمانہ الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے۔ اگر ہمارے نقاد غزل کو عشقیہ جذبات میں محدود سمجھتے ہیں۔ تو ان کو حافظ۔ نظیری۔ عرقی سب کو اقلیم سخن سے باہر نکال دینا چاہئے۔ کیونکہ ان کی غزل میں حکیمانہ اور فلسفیانہ مضامین تعداد کثیر میں موجود ہیں۔ غابر ہے کہ اس قسم کے نظریے اپنی تردید آپ کرتے ہیں۔ اگر کوئی نقاد تغزل کو پسند کرتا ہے۔ تو یہ اس کی اپنی پسند ہے۔ اس کو یہ حق نہیں کہ غزل کا دائرہ محدود کرے۔ اور اس کی تاریخ کو نظر انداز کر کے ایک خاص رنگ کو ترجیح دے۔ قلیل الفاظ کی اور بات ہے۔ وہ کسی صنف سخن

میں جاڑ نہیں۔ عالمانہ الفاظ جو معنوں شعر کے مطابق ہوں کسی طرح ممنوع نہیں
قراؤ دیئے جاسکتے ۔

روزمرہ اور سلاست الفاظ بشرطیکہ یہ واقعی شستہ روزمرہ اور سلیس زبان
ہوں تغزل کی جان ہیں۔ مگر وہ خاص قسم کی زبان جو روزمرہ اور سلاست کی تشریح
کے وقت سو فیصد اور عامیہ زبان بن جاتی ہے۔ غزل کو از حد ناگوار بنا دیتی
ہے۔ الفاظ کا مبہم استعمال ہمیشہ غلط نتائج پیدا کرتا ہے۔ تنقید نگاروں کو اس
زبان کا نمونہ پیش کرنا چاہئے۔ جس کو وہ فی الحقیقت سلیس اور بامعاورہ
خیال کرتے ہیں۔ دکھاوے کے طور پر وہ عموماً اس قسم کے شعر پیش کرتے
ہیں کہ:-

تم ہرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات یہ سن کر گلی نے قسم کیا
لیکن دراصل وہ اس قسم کی عامیہ زبان کو پسند کرتے ہیں۔ جو ان اشعار
سے متعلق ہے:-

جھپک بتا کے مجھے دلربا نے ٹوٹیا بچانگہ سے تو شرم و حیا نے لوٹ لیا
گریا رہا ہوسا تو بچا ہوا تو کس معمور شرابوں سے مینا نہ ہوا تو کیا
وہ روئے دیا ہے جان خوبی ہیں صاف جس کے سارے کتا بنی

ہم حال نہیں ہیں دل کا سنانے میں لگے ہیں
کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفۃ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی
قابل دید تھی گرمی میں پسینے کی بہا تر ہوا ہے عرقِ حسن سے بستر کیا خوب
ہمارے تغزل پسند نقادوں کی محبوب و مرغوب زبان عموماً بازاری

ہوتی ہے۔ یہ شاعری کو پست اور غزل کو مبتذل بنادیتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ
 فیوں پکائے ہیں۔ مجھے کو چم جاننا والے۔ ایک اچھا شعر ہے۔ اب آپ کو
 کون سمجھائے کہ یہ میر کے اُن اشعار میں سے ہے۔ جن پر شیفتہ نے پستش
 بغایت پست کا فخر چست کیا ہے۔ اہل زبان پر اُن کے مرغوب خاطر
 روزمرہ اور سلاست کی سو قیبت ظاہر کرنے کے لئے پہلے یہ ضروری ہے
 کہ اُن کے مذاق کی اصلاح کی جائے۔ اور یہ ایک آسان کام نہیں۔

دہلیہ دعویٰ کہ ذوق کی زبان عامیانا نہیں۔ اس کی تائید میں نقاد نے
 کوئی دلیل نہیں پیش کی۔ سب سے پہلے معترض کو سو قیانا زبان کی توضیح
 کرنی چاہیے۔ ہمارے خیال میں وہ زبان جس میں عام لوگوں کا مبتذل
 روزمرہ۔ محاورات۔ کہاوتیں۔ اور ناگوار الفاظ استعمال کئے جائیں۔
 سو قیانا زبان ہے۔ شاعری میں اس قسم کی زبان نہایت بری معلوم ہوتی
 ہے۔ کیونکہ شاعری کے لئے متانت اور سنجیدگی ضروری ہے۔ ہم یہ نہیں ثابت
 کرنا چاہتے۔ کہ بیخ بازار کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے دیوان کا
 مطالعہ فرمائیے۔ اور دیکھئے کہ وہ کہاں تک ہند زبان یا روزمرہ کا
 استعمال فرماتے ہیں۔ ذیل کے الفاظ پر مبصرانہ نظر ڈالنے سے اس کی نوعیت
 خود بخود معلوم ہو جائے گی۔

اے صمن۔ دل نہ اٹکائے۔ سینہ در۔ سو بھی۔ سہ۔ بل بے۔ تعویذ
 چاٹنا۔ واہ کیا۔ باروں کا یار۔ سمجھائی دینا۔ جلدی کام ہے شیطان کا۔
 جو آپ ہی۔ الہی پھر جو دلبر تاک کر مارا تو کیا مارا۔ مشکیں باندھ کر مارنا۔
 ماتھ پر ماتھ مارنا۔ مڑگاں کے بالکے۔ مٹی کے اوجھل شکار۔ نامرد مرد۔
 مرد جو اندر ہو گیا۔ گرد ہو جانا۔ بکھا ہوا پانی۔ شکر پردے ہی میں اس بُت

کو جیانی رکھا۔ ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا؛ باؤ کے گھوڑے پر چڑھنا۔
جلد جلد کمان پر چڑھانا۔ منہ پروانہ رکھنا۔ انگڑائیاں لینا۔ لوہو۔ منکا ڈھلکنا
پھھو لوں سے پھلنا۔ کمی کرنا۔ رخسارے کی تاب لے لے ہچکیاں
باندھا۔ چلہ باندھنا۔ برگ پاپ۔ گرد نامہ۔ سنجہ کھلنا۔ ندیدہ۔ دل بغل
میں مارنا۔ میں کی چھری گردن پر۔ دھر کھینچنا۔ کڑی کہنا۔ چھری پھیر بھی دو
نام خدا کا نئے کر۔ بات کو کھٹائی میں ڈالنا۔ منہ میں گھنگھنیاں بھر دینا وغیرہ
اگر یہ الفاظ اور مجموعہ ماٹے الفاظ ساقیانہ نہیں۔ تو ہم یہ چھنا چاہتے
میں۔ کہ آخر وہ کونسی زبان ہے۔ جس کو اس اہم صفت سے منسوب کیا جائے؟
جو مثالیں ہم نے پیش کی ہیں۔ ان کو اپنے اصلی مقام پر دیکھئے اور اندازہ
لگائیے کہ یہ کہاں تک ذوق سلیم کو محفوظ کر سکتی ہیں۔ شاعر کی عامیانیہ سُر
زیادہ تر اس کے طرزِ تحریر اور لب و لہجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ کیا ذوق
کا لہجہ متین ہے؟ ہم اس کا فیصلہ شاعر کے اپنے کلام پر چھوڑتے ہیں
اشعار ذیل جو اپنی قسم کے تنہا شعر نہیں۔ تنقید کا حق بخوبی ادا کر رہے ہیں
آہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہو سوا
پہنچا ہے شب کند لگا کر دماں قریب
نکلے دنیا سے کہاں احق اٹھا کر بارِ حُرُس
ہے اس کے کان زلفِ معنبر لگی ہوئی
نیٹھے ہیں دل کے نیچے والے ہزار ہا
جھپٹ جھپٹ تیوں کھانا کوئی ہم سے کھجے

ماٹے ری حسرت دیدار مری ماٹے کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دہشتی سے کتابت والے

نخل گل ہندی نہ بونصف بویں انگار
تو کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسہ سر زریہ بیا
اگرچہ میں مر بھی جاؤنگا تو کہیں ہے جیتا دم چاہا
وہ جب تلک اپنے آستان پہ میری تہ بند دیکھیں
دور کر باؤں کو سر ہے یہ کہتی لیلی
پر نہیں کان پہ مجنوں کے ذرا جوں پلٹی
سر بوقت فوج اس ظالم کے زیر پا ہے
یغیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
سب دنیا پس از مردن بھی دامگیر دنیا ہو
کہ اس کتنے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

اگر شیخ مرحوم کے مداح ان اشعار میں رکاکت نہیں محسوس کرتے تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ محبت کی طرح خوش اعتقادی بھی جو ہر بصارت سے محروم ہے۔ وہ اُن معایب کو نہیں دیکھتی۔ جن کو ضعیف سے ضعیف نظر بھی آسانی سے دیکھ لیتی ہے *

رہنما استدلال کہ ذوق کی زبان اردوئے معلیٰ ہے۔ اگر اردوئے معلیٰ کی فصاحت اور عمدگی کا انحصار لفظ 'معلیٰ' کی موجودگی اور 'قلعہ' کی شوکت پر ہے۔ تو ذوق کی زبان کے دلاویز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اگر اردوئے معلیٰ کے معنی فصیح و بلیغ زبان کے ہیں۔ تو اُس کا ذوق کی زبان پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ جامع مسجد کی سیرٹھیوں پر بیٹھ کر کوئی شخص اعلیٰ زبان سیکھے۔ ہمارے خیال میں وہ اس طرح ایک عامیانا بول چال سیکھے گا۔ کیونکہ عوام تعلیم یافتہ اور صاحب ذوق غلطوڑے ہیں۔ کہ فصیح زبان استعمال کریں۔ روزمرہ درست ملک سال زبان سکھائے تو سکھائے۔ فصاحت بلاغت نہیں سکھا سکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق مذاق کے ساتھ ہے۔ جس طرح ایک پنجابی اپنے صوبہ کی زبان صحیح طور پر جاننے کے باوجود فصاحت کے درجہ سے ساقط ہو سکتا ہے۔ اُسی طرح ممکن ہے کہ دہلی اور یوپی کے

خواندہ اہل زبان صحیح اردو بولنے کے باوجود فصیح البیان نہ ہوں۔ اگر درست
 زبان بولنا ہی قادر الکلامی کا معیار ہے۔ تو دلی۔ یو پی اور علی گڑھ کا ہر انسان
 فصاحت و بلاغت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ جو مرتجا ایک پاور ہوا مات ہے۔
 ذوق کی زبان خاص دلی کا روزمرہ سہی۔ مگر کیا یہ فصیح و شستہ بھی ہے؟
 اُن کے محاورات دیکھئے۔ مانتھوں کے طوطے اُٹنا۔ بالٹھ کاٹے نام ہو
 تلوار کا۔ میں کی چھری گردن پر۔ تنکا اتارنا۔ اور سرد ہونا۔ کون ہے جولان
 کو شعر و ادب کے لئے باعث زینت خیال کرتا ہے؟ ذوق روزمرہ
 کو بھی غیر خوش آئند طور سے استعمال کرتے ہیں مثلاً

ہو ایہ سینہ یکسر فار زار دشت غم میرا ز اُس نے پتھر پتہ رگڑا کہ ہوا لو ہو گرم
 بل بے لے آتش غم۔ دل کو کرے یہ تو لگا ز یہ موج بحر عشق کو یہ بل ہے۔ بل بے لے و
 وہ ہوں میں کیسو موج محیط اعظم وحشت ز تفتہ دل وہ ہوں کہ بیکر داغ سوزاں لعل
 میں وہ ہوں پنجر جس کو دیکھتا ہے قنبک ز زخم میرا ہے وہ ایذا دست محسوس کو لگا

بل بے وحشت اب تک بھی شایخ آہو کی طرح

شوقی نظارہ ہے جب سے اُس رخ پر نور کا

رشک سے اُس زلف کے کیا مشک سی بیکتر خوں

ہو بشر طے ترے آنے کا بھر دسہ ہم کو

لفظ قلق کی طرح سے دہی رہا قلق

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکیر بن جاتا

تنگ و تیر تو غا ہر نہ تھا کچھ پاس قائل کے

ابھی پھر جو دلبر تاک کر مارا تو کیا مارا

لکھئے اسے خط میں کہ تم اٹھ نہیں سکتا ز جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گرنا تو کیا

اسی طرح بیمار کی اپنے! رنگ سہرا! نیک! بچوں! دُخل کب ہے
 نور کا! واہ کیا۔ زمین شور۔ ترش ابرو۔ نہ ہو بے وقار۔ کب رتبہ ہو کم
 میرا۔ سو بھی۔ سرد مہری کا کشتہ۔ بچھائی دینا۔ ایسی چیزیں ہیں جن کو ذوق
 سلیم کبھی پسند نہیں کر سکتا۔

بعض اشعار محاورہ اور قواعد زبان کی رو سے صحیح ہیں مگر فصاحت
 اُن سے نفرت و استکراہ کے ساتھ روگردانی کرتی ہے۔

ہنگام بوسہ گرم جو وہ اک ذری ہوئے شکر قلعے لب لہینہ سے شکر تری ہوئے
 ن دانتوں کو کیا موتیوں سے کہتے ہو مہتاب دشنام ہو کے وہ ترش ابرو۔ ہزار دے
 عیت ہو پت غم کے حرار دس سے تو کہئے یوں میر دل میں جھتی ہے دنداں کی ان کے تپ
 گیارہ تو گدا دلدل میں جنس کے فحش سے نکل سکتا ہے کوئی استیلا کا کار دامن سے
 شمع سے چاہئے ہے خون کا دعویٰ ہم کو
 سر بہ وقت ذبح اس ظالم کے نیرپا ہے

خری مصرع اصول فن کے مطابق ہے۔ لیکن ذوق سلیم اس کی فصاحت
 قطعاً منکر ہے۔

مفرد الفاظ کا استعمال دیکھئے۔ تو طرفہ تر عالم ہے۔ یہاں بھی ہم اپنی
 ف سے کوئی رائے زنی نہیں کرنا چاہتے۔ داخلی شہادت خود صورت
 ات کو واضح کر دے گی۔ بے وقار۔ سینہ دور ٹھیکڑ۔ بے وقار۔ بدھی۔
 کا۔ جوں۔ لاکھا۔ ماء الحیات۔ بالکے۔ جال کے۔ بغلی۔ زہر کی گانٹھ۔
 ئے (یعنی مقام وہم و زن نائے) خنذقیں۔ بولائی پھرے۔ چھلا۔
 لئے کاٹل۔ بنکارو۔ نیچو۔ گدھا۔ تیق۔ مورچہ۔ حرام زادہ۔ مردم۔
 (دل کا) کیا وہ۔ ڈکار۔ کنگنا۔ نکیر۔ اس قسم کے لفظ ہر صفحے پر

اس قدر ہیں۔ کہ دیوان پر ایک موردِ ملح کا لشکر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے
 دوستی کی تراکیب یہ ہیں۔ کشتی طوفاں زدہ آسا۔ یرنگ کفک بنض نگی۔
 نالہ آہن گداز۔ کلک تیر نالہ۔ تیغ محرف۔ فرشتہ پاکدامن۔ تیغ لنگر دار۔
 درِ بلاق۔ حلقہ جیب۔ تنور آتش۔ نمک چش۔ غرہ جوہر۔ پاجنوں آغشتہ۔
 بالین فرار۔ تودہ تودہ۔ طوفاں طوفاں۔ پارہ پارہ۔ قطرہ قطرہ۔ نے
 قلیاں۔ چوب تیشہ۔ گس جام شراب۔ بندہ محکوم القضا۔ کیا ان میں سے
 اکثر ترکیبیں عالمانہ نہیں؟ اور کیا کل حموض بارد۔ فیہ نظر بعینہ اور
 الحوب خمدہ۔ کیا ہمارے نقاد اس زبان کو اردوئے معلّے قرار دیتے
 ہیں؟ اگر دئی اور نگینہ کا اردوئے معلّے ہی ہے تو معلوم نہیں۔ سوقیانہ
 زبان کیا ہوگی!

بعض الفاظ کے اجتماع سے جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ تنقید کی محتاج
 نہیں۔ گاسا۔ کفک۔ دپر پردہ۔ پاپا یا نہ پایا۔ جو آپ ہی۔ ماتنی جامہ۔
 مرادل دستان۔ یرنگ قہقہہ مینا۔ دیدہ ندیروں۔ بعینہ آبیائے
 باد۔ نشتر سرنیز کے تیزاب بنا۔

بعض الفاظ اور تراکیب اہل زبان اور دیگر اصحاب کو بغرض
 تحقیق پیش کئے جاتے ہیں کہ وہ کہاں تک موزوں ہیں۔ اور ان سے
 کسی شاعر کے کلام پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

ظلم طرفہ تر آنسو نے سیر مردمان بندھا ز حصار اک گرد اپنے شعلہ جوالہ ساں بندھا
 وہ ہوں میں گیمو موج محیط عظم وحشت ز دادی ظلمت میں اپنی فعل کبے نور کا
 بیشتر ہوتا ہے پیداواں شجر کا فور کا ز سر راو فنا میں ہوں ہبیائے مغر لیکن
 ان میں سے بعض تراکیب غالب کی جان درد تہمید اور جو ہر دست

آئینہ یعنی تاثیر کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ وہ ہوں میں، کب ہے، پیدا دنیٰ کی جگہ میں ہوں وہ، ہے کب، اور دُنیا پیدا، لگا کر دیکھئے۔ آپ کو نمایاں فرق نظر آئے گا۔ علاوہ ازیں بعض اشعار میں 'سب' اور 'چند' اور الفاظ کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔ شاید یہ کتابت والوں کی شوخی جتنی ہو ہم نے اس باب میں تحقیق نہیں کی۔ غالباً ذوق خود ان کا ذمہ دار ہے شعریہ ہیں :-

قسمت ہی سے چاروں آذوق و گرنہ سب فن میں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا
ہر داغ معاصی میرا اس دامن تر سے جوں حرف سر کا غزنم اٹھ نہیں سکتا
جھوٹ ہی جانوں کلام اس رہزن ایمان کا
پہن کر جامہ بھی آئے وہ اگر قرآن کا

حضرت نقاد نے یہ بہت معقول بات کہی ہے۔ کہ ستر برس پہلے کی زبان کا آج کل کی شستہ و رفته زبان سے موازنہ نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر جب ذوق کے معاصر ہی اُن سے ہزار درجہ بہتر زبان استعمال کر رہے ہوں ایسی زبان جو چند ایک الفاظ نکال دینے کے بعد موجودہ زبان سے کسی طرح کم فصیح نہیں۔ تو ہر انصاف پسند محقق تسلیم کرے گا۔ کہ ذوق کی زبان

لے دیوان ذوق مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد میں بھی یہ اشعار اسی طرح مرقوم ہیں، مؤلف حیات ذوق نے شیخ کے چند اور بھی ناقص شعر پیش کئے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ ذوق کا یہ شعر ہے

نشان بے رواجی گرد کھائے زور مٹ جائے
جھپک سے دیدہ مرا کی نقبش دم میرا
مہل ہے۔ ذیل کے شعر میں سے
سر بہ وقتِ دُجِ ام قاتل کے زیرِ پا ہے
یہ نصیب لگا کر لوٹنے کی جائے ہے
بقیہ نثر صفحہ ۱۷۴

نہایت ہی غیر فصیح ہے۔ مرزا غالب کا مذاق دیکھئے۔ ایک غیر فصیح لفظ دیکھو، استعمال کیا اور اس کے متعلق بھی ایک رقعہ میں، فرما دیا کہ یہ لفظ میری پسند کے خلاف نظم ہو گیا ہے۔ ذوق الفاظ اور محاورات کے متعلق اس قسم کا احساس نہیں رکھتے۔ غالب جیسا لطافت پسند شاعر تو کیا ظفر کی زبان بھی ذوق سے کہیں زیادہ صاف ہے۔ فرماتے ہیں کہ

وہ دیکھے بے طرح کچھ سیر کرنا مجھے ڈر ہے الہی خیر کرنا
بتو دل میں جو میرے آجے تم ہوا منظور کعبہ دیر کرنا
پیور سرد رہ و طوبے کو مصلحت ہمارا حائر دل طیر کرنا
غضب ہے تو پیر عاشق کو کھل کر فرنگی زاد تیسرا فیسر کرنا
ہرے ہونے پہ میرے زخم دل کے بھر آ کر اس چمن کی سیر کرنا
نہیں اس مصحف رخ پر مناسب تھے اسے زلف ننبے پیر کرنا
ظفر جاتے وہ میرے پاس کیوں
اگر ہوتا نہ پاس خیر کرنا

ذوق کی کوئی غزل ہے۔ جو اس قدر سیدھی سادی بے تکلف زبان

بقیہ صفحہ ۱۷۴) پائے مجھول زیادہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ صفتی ترکیب ہے۔ اسی طرح خال کی گس سے تشبیہ۔ لفظ تم سے استعمال جملہ محبوب کی تعریف کے سلسلہ میں اور کچھ۔ بل بے وقوف متروکات کو نظم میں بار بار لانا قابل اعتراض ہے۔ شیخ کے ایک شعر نے ذیل کے شعر پر جو اعتراض کیا

کہ اور آندھی میں گزرتی آجے خاک باد چل نہ سکیں گے آج پر آتش و آب خاک مباد
دو بالکل درست ہے اس شعر کا یہ لامعروضی کے لحاظ سے بالکل غلط ہے (خاور)

میں لکھی گئی ہو، ذوق کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیتیں ہیں۔ نازک خیالی اور زبان۔ تعجب ہے کہ ہمارے نقاد آج تک انہی چیزوں کی تعریف کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ یہی باتیں شیخ کی شہرت کو روز بروز کم کر رہی ہیں غالباً دنیا کے نامور شعرا میں ایسا کوئی شاعر نہیں گذرا جس کی زبان ذوق سے زیادہ پست ہو۔ شاید سودا، ناسخ اور انشاؤں سے بھی دو قدم آگے ہوں اس کا فیصلہ عمیق مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

ذوق کی زبان کو معاشرین کی نظر سے دیکھنے کا مشورہ خاص اہل زبان کا مشورہ ہے۔ ہم حضرت نقاد کی فہرست میں صرف دو اور مصنفوں کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ مرزا غالب اور ذوق سلیم کیا مرزا کا شمار اہل فضل میں نہیں؟ اگر ہے۔ تو ان کے اس فتوے کو کیوں نہ درست تسلیم کیا جائے کہ۔ ع

ہرچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است

جہیزدار ہاب ذوق سے استصواب فرمائیے تو وہ آپ کو تباہ کر دے گا۔ کے سوا اس زمانہ کے کسی اور شاعر کو مذاق اور زبان کی کشش کی صحیح احساس نہ تھا۔ اس لئے ان میں سے کبھی کی رائے بھی قابل اعتبار نہیں کیا عام بول چال کو پسند کرنے والے لوگ جو دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں ساری عمر کاٹی۔ اس زبان کو غیر فصیح یا غیر مستند قرار دے سکتے ہیں جن کو وہ خود پسند کرتے ہیں؟ اس کے لئے تو کسی صاحب ذوق یا باہر کے شخص کی رائے لینی چاہئے۔ مرزا غالب اس عہد کے شعرا کی انجمن میں شامل تھے۔ لیکن ان میں سے ایک نہ تھے۔ اس کے علاوہ ان کا مذاق بھی درست ہے۔ ذوق کی شاعری اور زبان کی نسبت ان کی رائے کسی پر مخفی نہیں مگر ان کی رائے کو حریف کمال ہونے کی حیثیت سے درست

نہ تسلیم کیا جائے۔ نوخیز ذوق کے کلام کے مطالعہ نے۔ ہم پر جو کیفیت ظاہر کی ہے۔ اُس کو پیش نظر رکھئے۔ داخلی شہادت سے بہتر اور شہادت کیا ہو سکتی ہے؟ واضح رہے کہ ہم یہ باتیں ایک محقق اور غیر جانبدار نقاد کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں۔ ہمیں ذوق سے ذاتی عناد نہیں اس لئے اگر ہم یہ بے لاگ رائے ظاہر کریں کہ شیخ کی زبان نہایت پست ہے تو امید ہے کہ اہل الرائے حضرات اس کو درست تسلیم کریں گے۔ ہم حالی مرحوم کو ایک بہت سنجیدہ انسان خیال کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ اُن کی طبیعت کا رجحان عام بول چال کی طرف تھا۔ اس لئے عجب نہیں کہ انہوں نے ذوق کی زبان کی تعریف کر کے ایک غلط رائے دی ہو۔ یہ مختصر مضمون اجازت نہیں دیتا کہ ہم شیخ کا ایک ایک شعر لے کر ایک ایک لفظ کے فصیح و غیر فصیح، موزوں و غیر موزوں ہونے پر بحث کریں۔ کبھی موقع ملا تو ہم ناظرین پر ظاہر کریں گے۔ کہ ذوق کی زبان کس قدر ناقص ہے *

یہ عجیب و غریب استدلال بھی اہل زبان مخصوص ہے کہ ذوق نے تہی بیسیوں کو صاحب دیوان کیا۔ اور آزاد جیسے نثار بعدیل کو پروا چڑھایا۔ ظاہر ہے کہ ادیب اور شاعر کسی کے بنائے نہیں بنتے۔ اگر آزاد اور داغ مشہور ہوئے۔ تو اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے ہوئے۔ استاد کی تعلیم و تربیت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اگر اُس نے داغ اور آزاد پر کچھ اثر ڈالا۔ تو وہ مفید ثابت نہ ہوا۔ داغ نے اپنے استاد کی طرح لفظوں کا طعم قائم کیا۔ اور حقیقی شاعری سے دور جا پڑا۔ آزاد کا مذاق اس قدر شراب ہوا کہ وہ زندگی بھر اس کو درست نہ کر سکا۔

اُس کی طبیعت پر تخیل کا رنگ اس قدر غالب ہوا کہ وہ لطیفوں اور
استعاروں کے بغیر ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتا۔ ہمیں اس سے انکار
نہیں کہ آزاد صاحب کمال ہے۔ لیکن جہاں تک آپ کے استاد کا
تعلق ہے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اُس کا اثر آپ پر اچھا نہ ہوا۔ اگر اس
جواب پر بھی ہمارے نقاد کہیں کہ آزاد جو کچھ بنا ذوق کے اثر سے بنا تو
ہم کہیں گے کہ اس طرح اقبال کو داغ نے فہرہ آفاق بنایا۔ حالی اپنے
استاد غالب کی نظر عنایت سے مددس لکھنے کے قابل ہوا اور خود
مرزا غالب نے اپنے معلم ہر مزد سے شعر کہنا سیکھا! یہ ہے فرضی باتوں
پر تنقید کی بنیاد رکھنے کا نتیجہ!!

شاعرانہ زبان ذوق کی زبان فرسودہ ہے۔ یوں تو اس زمانہ کے
تمام شاعر ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مگر ذوق نے اس کو سب سے
زیادہ ناگوار طور سے استعمال کیا۔ مرزا غالب بھی یہی شعریہ استعمال میں لاتے
ہیں۔ لیکن وہ صاحب ذوق ہیں۔ اور دوسروں کی نسبت اس سے
کہیں بہتر اثر پیدا کرتے ہیں۔ شیخ اس کو تخیل کا جامہ پہنا کر اور بھی
ناگوار بنا دیتے ہیں۔ وہ صرف زخم دل کی ترکیب پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ اس
پر اور بھی پھلتے ہیں۔ وہ اس سے کوئی خاص مضمون ادا نہیں کرتے بلکہ
تخیلی صنایعوں کا مرکز بنا لیتے ہیں۔

سینے کا چاک سینے کی فرصت کہاں کہ ہیں
کیوں ایم سدا نکلے نہ آہن کے جگر سے
منہ سے گر جراح کے سُن پانام انگور کا
آگے تھا صد برگ پہ لگی اب ہزارا ہو گیا

سینے کا چاک سینے کی فرصت کہاں کہ ہیں
نالوں کے اثر سے مرا پھوڑا سا ہے پکتا
زخم ہے میرا وہ ایذا دہنوں کو لگا
دل پہ زخموں کی ترقی ہوئی اور اک بہا

دل مجروح پہ پیر نہ سمجھو داغ حسرت کا پروا دس اُس زخمی نے ہوائے دوستان نہ
خراش سینہ میں اک ہ گیا ہے ٹوٹ کر ناخن غلط ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ پھاما ہے مرہم کا
ہے ملک پاش جو ہنس ہنس کے وہ لعل نکلیں
لے رہا ہے دل مجروح جراحت کے مڑے

اسی طرح شیخ وحشت - جنون - سبائی - عنقا - افعی - چرخ - محشر -
بسل - تمام الفاظ کو نئی نئی صورتوں میں جلوہ گر کرنے کے عادی ہیں - اور
ہمیشہ ایک ناگوار اثر پیدا کرتے ہیں *

محاسن و معایب شیخ کی شاعری کے معایب - اس کے محاسن
سے بہت زیادہ ہیں - یعنی اگر وہ شب تاریک

سے مشابہت رکھتے ہیں - تو یہ ایک دھندلی صبح کا ڈب کے مماثل
ہیں - آزاد سے بڑھ کر ذوق کا مدار کون ہو گا؟ وہ بھی اُن کی شاعری -
میں زیادہ خوبیاں نہیں دکھا سکا - آزاد کے نزدیک شیخ کی شاعری کی
بہترین خصوصیات ضرب الامثال - محاورات اور معتقات عوام کا جرسہ
استعمال - سادگی - صفائی - مثالیہ اشعار - قادر الکلامی - سنگلاخ زمینیں
جامعیت - پر لطف عشقیہ شاعری - نئی بحریں - عمدہ تشبیہات - اور
ناز کھیلایاں ہیں - ان میں سے بعض یعنی سادگی - صفائی - زبان -
ضرب الامثال - جامعیت اور عشقیہ شاعری کی حقیقت آپ نے سن لی
یہ تمام ذوق کی شاعری کے معایب ہیں - محاسن نہیں - جس شاعر کی خوبیاں
ہی اس کی برائیاں ہوں - اُس کی شاعری کی تعریف میں کچھ کہنا بے سود
ہے *

ذوق کے تبحر علمی اور ذخیوہ الفاظ ایک عالم کے شایان شان ہیں -

لیکن آپ نے ان کا درست استعمال نہ کیا۔ اس لئے یہ خوبی بھی عیب میں تبدیل ہو گئی ہے *

دشوار گزار زمینوں میں شعر کہنا قابل ستائش نہیں۔ یہ ایک عقلی کارنامہ ہے۔ اور تخیل یا احساس کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا *
عمدہ تشبیہات ذوق کے ماں بہت کم ہیں۔ جو تشبیہیں کسی قدر اچھوتی ہیں۔ وہ بھی اچھی طرح استعمال نہیں کی گئیں *

ذوق کی شاعری موسیقیت۔ رنگینی اور لطافت سے معمور ہے۔ اُن سے زیادہ روکھا پھیکا کلام کسی اور شاعر کا نہیں۔ اُن کے اشعار میں اُسی قدر نرم ہے۔ جتنا خالی سجاوہ اور ان میں۔ رنگینی اور لطافت اعلیٰ تخیل اور سمجھے ہوئے مذاق کے ثمر ہیں۔ شیخ ان دونوں سے محروم ہیں۔ اس لئے اُن کی شاعری نہایت خشک اور بے کیف ہے *

ذوق کی مثالیہ شاعری کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ درحقیقت یہ بھی اُن کی ایک برائی ہے۔ مثالیہ شاعری کے لئے ہم نے اعلیٰ استعداد اور تخیل ضروری قرار دیئے ہیں۔ شیخ ان دونوں سے ہی دست ہیں۔ وہ مثال کو خوش اسلوبی سے برتنے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ اُن کی نظر اعلیٰ مثالوں تک نہیں پہنچتی۔ مثال شعر میں ہمیشہ غیر محسوس طور پر آنی چاہیئے۔ جوں جیسے۔ جس طرح کا استعمال تشبیہ پیدا کرتا ہے۔ جو استعارہ و کنایہ کی نسبت بہت کم اثر اور ادنیٰ ہے۔ اگر تشبیہ بھی احتیاط سے لائی جائے تو شعر کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ مگر جس طریقے سے ذوق اس کو شعر میں لاتے ہیں بالکل غیر شاعرانہ ہے۔ ذوق کا تخیل اُس انتہائی شدت کے عالم میں کام نہیں کرتا۔ جس میں استعارہ۔ کنایہ یا 'مضمر تمثیل' پیدا ہو۔ مولانا طباطبائی

مرحوم فرماتے ہیں: ”یہ طرز بیان کہ لفظ تمثیل کو ذکر کریں۔ تمثیل کو ترک کریں اُس بیان سے بلیغ تر ہے۔ جس میں تمثیل و مثل دونوں مذکور ہوں۔ جس طرح استعارہ بلیغ تر ہوتا ہے۔ بہ نسبت تشبیہ کے۔ لیکن جس طرح استعارہ میں یہ شرط ہے کہ مشبہ کی طرف جلد ذہن منتقل ہو جائے۔ مثلاً یوں کہیں کہ جیسا بیج بوؤ گے ویسا پھل پاؤ گے۔ اس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے۔ اور مثل کا ترک کرنا اس سبب بہتر ہوتا ہے کہ ایسا ابہام جس کے بعد انکشاف فوراً ہو جائے۔ ذہن سامع کو لذت بخشتا ہے۔ اور یہ لذت اُس لذت سے بڑھی ہوئی ہے۔ جو ذکر مثل سے حاصل ہوتی ہے۔“ یہ تمثیل مضمیر کی ایک قسم ہے۔ مثلاً۔

پہناں تھا دام سخت قریب آشیانے کے

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہے مشتعل نمودِ صورت پر وجودِ بحر

یاں کیا دہرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

بعض تمثیلیں ایسی ہوتی ہیں۔ کہ ان میں حرف تشبیہ نہیں لایا جاتا۔ بلکہ

تمثیل۔ مثل کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ہم اس کی معقولیت کو محسوس

کرتے ہیں۔ اس کی موزونیت یا درستی ہمیں جتنا فی نہیں جاتی مثلاً

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں غیب میں ہنوز جو جاگے ہیں غیب میں

زنگِ تمکین گلِ ولالہ پریشاں کیوں ہے گر چراغانِ سررہگذر باد نہیں

دفا داری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گھاڑو برہمن کو

آخری شعر کی تمثیل پر غور کیجئے۔ پہلے شعر میں صائب کی طرح ایک دعویٰ

کیا گیا ہے۔ دوسرے میں اُس کی تصدیق کی گئی ہے۔ مگر تمثیل کو کھلے الفاظ میں بیان نہیں کیا گیا۔ دوسرے شعر میں بھی یہ نہیں کہا کہ دیکھو۔ لالہ و گل چراغان سر بگذا ر باد۔ کی مانند فنا ہوئے جاتے ہیں۔ اس لئے دنیا کی ہر چیز زوال پذیر ہے۔ یہ تمثیل کا بہترین اسلوب ہے۔ ذوق کے مثل اور تمثیل آپس میں مربوط نہیں ہوتے۔ ان کا مقام اتصال حرفِ تشبیہ کی وجہ سے فوراً نظر آ جاتا ہے۔ اس لئے ان کے دونوں مصرعے اور تمثیل و مثل مباہلے رہتے ہیں۔ آپس میں متحد نہیں ہوتے۔ ساتھ ہی قاری کا تخیل بھی بیدار نہیں ہوتا۔ اس لئے ذوق کی تمثیلیں مجموعی اثر یا کیفیت نہیں رکھتیں اور اگر رکھتی ہیں۔ تو بہت معمولی۔

کہا جاتا ہے کہ ذوق کے اشعار میں کجھلک اور اشکال نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ وہ دانستہ سادہ شعر کہتے ہیں۔ بلکہ ان میں مشکل شعر کہنے کی اہلیت ہی نہیں۔ ان کا تخیل اُس نقطہ عروج کو نہیں پہنچتا جہاں اشکال کا امکان ہو۔ اور جہاں خیالات اس قدر زبردست ہو جائیں کہ وہ آسانی سے روئے قرطاس پر منتقل ہو سکیں۔ شیخ اپنے ذہن کی کوتاہ دستی اور رواندگی کے باعث اشکال سے قاصر ہیں۔ ورنہ ان کی تکلف پرستی اس قدر شدید ہے کہ وہ تعقید سے کبھی پرہیز نہیں کر سکتے۔

سادگی ہے۔ عدم قدرتِ ایجادِ غنا

ناکسی مہینہ نالہ تو کل تا چندر

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ ذوق کو عدم اشکال کی بنا پر ایک اعلیٰ شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ کلام کے آسان ہونے سے کوئی شاعر پر عظمت نہیں بن سکتا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ ذوق کے بہت سے شعر زبان زد عام ہیں۔ یہ درست ہے۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ اس قسم کے شعر کہنے والے لوگ بلند پایہ شاعروں؟ سعدی علیہ الرحمۃ سے زیادہ اور کس نے ضرب المثل شعر کہے ہیں؟ پھر بھی اُس کو ارباب تنقید نے صاحب تخیل شاعر تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ کہاوتیں بنانا عقل کا کام ہے۔ ذوق کے ضرب المثل اشعار میں رنگینی اور لطافت نہیں۔ یہ تخیل سے پیدا نہیں ہوئے۔ اس لئے ادبی حیثیت سے وقیع نہیں۔

آزاد نے لکھا ہے۔ کہ ذوق کے اشعار میں الفاظ زاید از ضرورت نہیں ہوتے۔ ہم ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہیں کر سکتے۔ شعر جھٹ نثر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ ذوق محذوفات سے کام نہیں لیتے اس لئے ان کا طرز بیان ہمیشہ سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ خوبیاں بھی سب کی سب برائیاں ہیں۔ ذوق کے اشعار میں الفاظ زاید از ضرورت اس لئے نہیں ہوتے کہ انہوں نے نثر کی زبان میں شعر کہے ہیں۔ تیر و نجر مرغ بسل۔ گل و بلبل۔ اور اس قسم کے دیگر پرانے الفاظ کے علاوہ ان کی زبان میں کوئی شاعرانہ خصوصیت نہیں۔ یہ ایک بڑی کمزوری ہے۔ چونکہ ذوق صاحب تخیل نہیں۔ اس لئے ان کی زبان بھی شاعرانہ نہیں ذوق تخیل کی زبان میں شعر نہیں کہتے۔ بلکہ شہر کے گلی کوچوں کی عام بول چال میں شعر کہتے ہیں۔ جو شاعرانہ زبان کی شیرینی اور لطافت سے کوسوں دور ہے۔ شاعری کی زبان ہمیشہ تقبیل الفاظ بلا اختلال معنی کا مصداق ہوتی ہے۔ اور تفصیل الفاظ اعلیٰ تخیل کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر چونکہ شاعرانہ انداز لازمی طور پر بلیغ ہے۔ اس لئے نثر کرتے وقت

ہیں الفاظ بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ نثر کو نثر کا تسخیل حاصل ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے۔ کہ جس بات کو ہم ذوق کی خوبی خیال کرتے ہیں۔ اُن کی ایک کمزوری ہے۔ سادگی اُن کے بہت تخیل کی آئینہ دار ہے۔

شیخ ایک قادر الکلام شاعر نہیں۔ اُن کی قوت بیان نہایت ناقص ہے۔ اُن میں مضمون کو ادا کرنے کی قوت بہت کم ہے۔ آزاد نے کہا ہے کہ ذوق نے جہاں کوئی لفظ بٹھا دیا ہے۔ وہاں سے اٹھا کر کسی اور جگہ نہیں رکھا جاسکتا۔ اُس کا یہ دعویٰ صرف اسی قدر درست ہے کہ ہم ذوق کے اشعار میں ہر جگہ لفظوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس کرتے

سہ ذوق کے بہت سے مشہور شعروں کی زبان ردایح عام میں اور ہے اور دیوان میں اور۔ مذاقِ سلیم نے ان میں اصلاح کی گنجائش پائی۔ اور تغیر و تبدل سے کام لے کر اُن کو عام استعمال کے قابل بنایا۔ یہ ذوق کی قوت بیان کے ناقص ہونے کی ایک بین علامت ہے۔ جو آزاد کے زیر بحث دعویٰ کی تردید کرتی ہے۔ اشعار یہ ہیں۔

کھل کے گل کچھ تو بہا اپنی صہاد کھلا گئے حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن مر جھا گئے
تصبیح۔ پھول تو دودن بہا رہا نفزا دکھلا گئے۔

ذوق ۵۔ بونہ گل ہم دی کے گلبن شک گل گلوں میں

آکھڑا ہو رکھ کے میرا کاسہ سر زیر پا

اصلاح کے بعد یہ نخل گل ہم دی نہ بول نصف سو میں لے لگا رہا

تو کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسہ سر زیر پا

دیکھو بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸ پر

ہیں۔ اُن کی بندش ہمیشہ سست ہوتی ہے۔ تو مزگاں کی طرح سے اس کے
 داغِ خونچکاں ہوتا۔ اس مصرع کی بندش دیکھئے۔ اُس کے ضرورت
 شری کی وجہ سے کہاں کہاں جانکلا ہے۔ اقصیٰ نہیں چاہتا میں وہ
 جائے یہاں سے۔ یہ شاید سہو کا تب کا نتیجہ ہے کہ نہ شریں مرگیا سکتا
 ہے۔ اہل تکبیر کریں پوست ہرن کا۔ کاغذ اس کی نشر یہ ہے کہ اہل تکبیر
 ہرن کی پوست کا کاغذ بنائیں۔ کیا ذوق نے اس مضمون کو درست ادا
 کیا؟ اس کا فیصلہ آپ خود فرمائیجئے۔ فرماتے ہیں کہ سہ
 دل کرتا ہے اس کو چہ کا جب قصہ۔ تو لیتا
 طائر کی جگہ رنگ پریدہ سے شکوں ہے

اس میں تو لیتا، کا بے طور استعمال لائق توجہ ہے۔ اسی طرح ذیل کے
 مصرعوں میں بندش کی سستی محتاج توضیح نہیں۔
 ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے غم نہ رکھنا پر نہ رکھتا منہ پہ دانہ یہ مرہض غم
 اگرچہ میں مر بھی جاؤں گا تو کہیں ہے جیتا۔ دم چہرا یا
 نگہ ناز اس کے عاشق سے چھوٹ کس کس ادا سے لڑتی ہے

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸۳

ذوق ۵ ابر کیا آنسو پہانا کوئی ہم سے یکہ جائے
 برق کیا ہے تلانا کوئی ہم سے یکہ جائے
 اصلاح کے بعد ابر تر آنسو پہانا کوئی ہم سے یکہ جائے
 برق مضطر تلانا کوئی ہم سے یکہ جائے
 سہ دیوان ذوق مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم میں مصرعہ اولیٰ اس طرح ہے
 غل بھلا کچھ تو ہماریں لے صبا دکھلا گئے
 اس کے اجزائے ترکیبی پہلے سے بھی زیادہ سست ہیں۔

چاندنی کا پھول ہوگا رخوانی ہے بجا و دے گا طامس اپنے بال پر کے سارے نقشِ دھو
گردِ کلفت کو دلِ عالم سے گویا دھو دیا و اڑائے خوب کچھڑے نکل مجنوں زندان
قاتل مرے ہو کہ تباہی سے دھو کہیں و فرشتہ پاک دامن لے کے میرے تار دامن سے

سردارِ فنا میں ہوں مہتیا نئے سفر لیکن

اس قسم کے ناقص اشعار کی کثرت کو دیکھ کر بے اختیار مرزا غالب کا یہ

مصرع یاد آجاتا ہے کہ **ع**

ایجا گستہ اند عثمان شمارہ را

ذوق کی سست بندش ان ناقص اشعار ہی تک محدود نہیں۔ یہ

مصرعے ملاحظہ ہوں۔

ہمارا آپ کو جو خاک ہوا کسیر بن جاتا و تنگ تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
ابھی پھر جو دلبر تاک کر مارا تو کیا مارا و دل بدخواہ میں تھا مارا نیا چشم بد میں
عزاداری میں ہے کس کی یہ چرخ مانتی جا و رکاوٹ دل کی اس قاتل کے وقت تیج ظاہر
دین ایمان ٹھونڈھتا ہے ذوق کیا اس وقت میں و تو میں نے تار اک رونے کالے لے بچکیاں
دلیران محبت کو غلش سے اُس کی مڑگاں کے

خبر سنتے ہی قاصد سے ہوئے ہم بے خبر بالکل

عصمت بھی ہے کیا شے کہ اگت بوسہ کھلا در پائے مقفل سے۔ عزیزاں نکل آیا

کرنے جو تو نہال۔ تو لائے ابھی نکال۔ بدویں کا خوشہ گاد پھر کہن کی شاخ

پہلے مصرع میں 'خاک بنو'، 'خاک ہو کر'۔ اور آپ کو اپنے آپ کی جگہ

زبان کے گلے پر ایک زنگ آلود چھری ہے۔ دوسرے مصرع میں 'بظاہر'

کی جگہ ظاہر زبان پر ایک اور ظلم ہے۔ تیسرے مصرع میں 'دلبر نے تاک کر مارا'

یہ شاید ظاہر کا تعلق نہ تھا کے ساتھ ہو۔ اس صورت میں فاعل تنگ تیر جمع اور ظاہر نہ تھا

مفرد ہے۔

کی جگہ دلیر تاک کر مارا زبان پر جو روستم کی انتہا ہے۔ یہی حالت باقیماندہ مصرعوں کی ہے۔ ان کے اسقام اپنا اعلان آپ کر رہے ہیں۔ ان سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جوشا عرغل جیسی مختصر صنف میں ادائے مطلب پر قادر نہیں۔ طویل نظموں میں اس پر کیا گزرے گی۔ اگر اس کو حفیظ یا اقبال کی مانند کوئی طویل نظم تحریر کرنی پڑتی تو ہر صفحہ ناقص بندشوں کے ہجوم سے گرا بنا رہو جاتا۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ طویل غزلیں غزل کی روح - اجمال کے خلاف ہیں۔ ذوق نے متعدد طویل غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں آپ نے متعدد قص قافے استعمال کئے ہیں۔ جو قاری کی طبیعت کو نہایت ناگوار گزرتے ہیں ایک غزل میں فتح گھسیٹا۔ جھنجھوڑا۔ قلق یا۔ سنجوڑا۔ ٹیکا۔ پٹکا وغیرہ قافے لائے ہیں۔ یہ بدیہا خشنوت آمیز ہیں۔ اور تغزل کے نازک ساغر کے نئے سنگ سخت کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ذوق کی شاعری اپنی متانت۔ لطافت اور رنگینی کو کھو کر بے لطف نثریت کا شکار ہو گئی ہے۔ اس بربریت کی شاعری کے لئے عہد حاضر کی ہوا اس نہیں۔ خواہ اس کو بلند پایہ ثابت کرنے کی کتنی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ یہ کبھی مقبول عام نہیں بن سکتی۔

اصناف سخن | ذوق کی غزل گوئی پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ ان کی رباعیاں معمولی ہیں۔ ان کی تعداد بہت

فہل ہے۔ غالباً یہ شیخ کی منتخب رباعیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کچھ حقیقی جذبات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ذوق نے زیادہ شہنیاں اور قطعات نہیں لکھے۔ شاید یہ غدر کے آشوب عظیم میں تلف ہو گئے ہوں۔ آج کل جو قطعات اور ایک آدھ

مثنوی مروجہ دیوانوں میں نظر آتی ہے۔ اُن میں بھی وہی خامیاں ہیں۔ جن سے اُن کی غزل از نوا افتادہ ساز بن کر رہ گئی ہے *
 رہا قصیدہ اور سہرا۔ ان میں ذوق کی عظمت اب تک تسلیم کی جاتی ہے لیکن جدید آئین تنقید کی رو سے یہ بھی ناقص ثابت ہوتے ہیں۔ قصیدہ میں ذوق کی شاعری غزل سے بھی زیادہ پست ہو گئی ہے۔ یہاں اُن کی تحسین کی کھلا میدان مل گیا ہے۔ اور وہ اس پر اپنی تمام ”سخن بر انداز“ قوتوں کے ساتھ متصرف ہو گئی ہے۔ ذوق نے قصیدہ گوئی کی بنیاد قدیم اصولوں پر رکھی اور انشا و سواد کا متبع کیا۔ صنعت پرستی۔ لطافت۔ مبالغہ۔ پامال مضامین۔ سنگدلی زمینیں۔ ساری کی ساری باتیں قدیم طرز کی ہیں۔ ان میں شاعر کے حقیقی جذبات کو کوئی دخل نہیں۔ آج کل ذوق کے قصیدے اسی وجہ سے غیر مقبول ہو گئے ہیں *
 چونکہ ذوق کے قصائد ہمارے معیار کی رو سے وقع نہیں۔ اس لئے اُن میں معنوی خوبیوں کی تلاش بے سود ہے۔ ذوق نے اُن میں مبالغہ آمیز مضامین کے بغیر اور کچھ قلمبند نہیں کیا۔ ناظرین کہیں گے کہ دوسرے شاعروں کے قصائد میں بھی اس قسم کے مضامین مندرج ہیں۔ صرف ذوق ہی ان کو نظم کرنے کا گنہگار نہیں۔ بلا شک دیگر شعرا بھی یہی مضامین ادا کرتے ہیں۔ اور ان کے قصائد اُمی حد تک پڑھے جانے کے لائق ہیں۔ جہاں تک وہ ذوق سلیم کو حظ پہنچاتے ہیں۔ غالب۔ ثنائی۔ عرفی وغیرہ کا اسلوب بیان اور طرزِ تحریر شگفتہ ہے۔ خواہ وہ غیر عادی مبالغہ ہی سے کام لیں۔ اُن کی شعریت زایل نہیں ہوتی۔ مثلاً غالب لکھتے ہیں۔

بغضہ دشوار کہ کوسنس سے نہ وا ہو تو نا کرے اس عقد کو سو بھی باشارت

مکمل ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر گر لب کو نہ دے چتر و جیواں سے طہارت
 اصف کو سلیمان کی دُزار سے نظر تھا ہے خضر سلیمان جو کرے تیری وزارت
 ہے نقش مریدی ترا فرمان الہی ہے داغ غلامی ترا تو قبیح امارت
 تو ابے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں تو آگ سے گردِ دفع کرے تابِ شرارت
 ڈھونڈھے نہ لے موہ و ریاضِ روانی

باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ان اشعار میں مبالغہ ہے۔ مگر بیانِ اس قدر سلجھا ہوا ہے اور عبارت
 اتنی دلپذیر ہے کہ پانچ سات اشعار تو کیا طویل نظم بھی ہو۔ پھر بھی ہم اس کے
 مطالعہ سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اس کے خلاف ذوق کے ایک دو شعروں
 ہی سے طبیعت اس قدر منعض ہو جاتی ہے کہ ہم جو ہر بصارت کو اس
 پر خفا یج کرنا پسند نہیں کرتے +

ذوق کا مشہور قصیدہ ہے۔ واہ واہ کیا معتدل ہے۔ باغِ عالم کی ہوا
 آسان شاعری کے مداحوں کو اس سے غور کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ اگر آج
 کوئی فاعل اس قسم کی نظم تحریر کرے تو نقاد حضرات فوراً اس کو صدی اعتباراً
 کا ہدف بنا دیں گے۔ حفیظ کے شاہنامہ اسلام میں بہت سے ناقص مشر
 ہیں۔ صدی شعروں کی بندش سست ہے۔ لیکن وہ ذوق سے بدرجہا بہتر
 شاعر ہے۔ اس کے نقائص ذوق کے مقابلہ میں بہت معمولی ہیں۔ بایں
 ہمہ نقاد اس پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں تا مل نہیں کہ اس اندازہ لگایا جا
 سکتا ہے۔ کہ اگر آج ذوق جیسی ناقص شاعری سے کام لیا جائے تو ناقدان
 فن شاعر کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ ہم دلائل کے بغیر کوئی دعویٰ نہیں
 کرنا چاہتے۔ اور ذوق کے مشہور قصیدوں پر تنقیدی نظر ڈال کر دکھاتے

ہیں۔ کہ وہ ایک تاظم کی حیثیت سے بھی درخورِ اعتنا نہیں ہے۔ پہلا قصیدہ بادشاہ کے غسلِ صحت پر لکھا گیا ہے۔ یہ سارا قصیدہ ایک طرف اور غالب کی ایک مختصر سی نظم ”پھر اس انداز سے بہار آئی“ ایک طرف۔ جو اثر غالب نے چند شعروں سے پیدا کر دیا ہے۔ وہ خاقانی ہند، ایک سیر حاصل قصیدہ سے بھی نہیں پیدا کر سکے۔ ”بلخ غسلِ صحت کے لئے تمام امراض کے دور ہونے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ پہلے شعر میں ”واہ واہ“ انشاک کے بعد ”رے۔ بل بے دغیرہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ ”باغِ عالم“ اور ”نبضِ صاحبِ صحت“ پیش پا افتادہ تشبیہات ہیں۔ اور چونکہ جان بچھ کر لائی گئی ہیں۔ اس لئے نظروں میں کھٹکتی ہیں۔ یہ اعلیٰ تشبیہات کی طرح ساحرانہ اثر نہیں رکھتیں۔ دوسرا شعر معیولی ہے۔ تیسرے شعر میں ”مو۔ سیا“ کی آواز گمراہ ہے۔ چوتھے شعر میں ”ذوقِ کاہر“ سے خرامِ محاورہ ”یہ“ پھر پیش نظر ہے۔ پانچویں شعر میں ”بید مجنوں“ کے ساتھ ”پتا“ کا لفظ آیا ہے جس میں نہایت بے لطف ایہام ہے۔ چھٹے شعر میں حرفِ تشبیہ ”جوں“ دہنگر نظر ہے۔ ساتویں شعر میں ”صفرا“ کا ذکر ہے۔ اس قسم کی تلمیحات از روئے مذاق نہایت معیوب ہیں۔ آٹھویں شعر کے مصرعِ ثانی کی بندش بہت ناقص ہے۔ لفظ ”بلغی“ ”صفرا“ کا برا مقابل ہے۔ نویں شعر میں ”نے“ کا استعلاء اور ”سمیت“ شاعر کی خامی مذاق پر دلالت کرتے ہیں۔ دوسرا مصرع تنہا ناقص ہے۔ بالخصوص قافیہ اس قدر بھدا ہے۔ کہ ایک مہندی بھی اس کو نظم میں لانا پسند نہیں کرتا۔ ”جدوار“ ایک غیر بانوس لفظ ہے۔ دوسرے مصرع کے متعلق کچھ کہنا بے سود ہے۔ اگلا شعر اس سے بھی زیادہ ناقص ہے۔ ”ونبالہ“ اور ”ہرہ“۔ ایسے لفظ ہیں۔ جن کو ایک شستہ مذاقِ شاعر

اپنے کلام میں کبھی استعمال نہیں کر سکتا۔ راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دورہ۔ لفظی عایتوں کا پتہ رہا ہے۔ دوسرے مصرع میں بھی دوران سر موجود ہے۔ مونیہ بند اور ہوا الشافی، کا شاعری سے کیا کام؟ کہتا ہے بیمار بس کر۔ مجھ کو ہے بالکل شفا، تنقید سے بے نیا رہے۔ ارباب فہم کو ان اشعار پر توجہ دینی چاہیے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ ذوق کی قوت کھو کیسی ہے۔ اگلے شعر میں پہلے کی طرح لفظ 'درد' کی ظاہری صورت پر شعر کا دار و مدار ہے۔ لا غروں کو ہو کہاں تاب و طاقت یہ شتاب۔ اس مصرع کو پڑھنا ہی دشوار ہے۔ ہر لفظ پر زبان لگتی ہے۔ یہ پھر موجود ہے۔ شتاب، فصیح شاعروں کی زبان پر نہیں آنا چاہیے، کیسے ایک اور سنگِ فلاخن ہے۔ ہو جائے، کی جگہ ہو پھر وہی دست و پا شکستہ زبان ہے۔ سپیدی آگئی، صادق ہے ایسی اشتباہ، خورشید کا قرص رات بھر ٹھونکا کیا۔ تعجب ہے کہ اہل زمان اس قسم کی شاعری پر کیوں فریفتہ ہیں۔ پھر جو دیکھا صبح کو اصد شکم میں کچھ نہ تھا۔ یہ مصرع صریحاً ذم کا پہلی لئے ہوئے ہے۔ اگلے دو شعر ہیں۔

پہنچی یہ تنفیج کی نوبت کہ نہ بتخانے میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکائیں کزنا
کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا فعل
جون اصاب اس کے نہیں مطلق شکم میں املا

ان اشعار پر تنقید کی جائے تو امس کا اپنا رتبہ پست ہو جاتا ہے۔ قارئین خود ان کی ادبی وقعت اور محاسن کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہمیں یہاں ذوق کی مذمت ملحوظ خاطر نہیں۔ صرف اس کی شاعری کی نوعیت

دکھانا بمقصد ہے۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس قسم کے شعرا ایک صاحب کمال کے لئے باعث ناز نہیں ہو سکتے *
 ذوق کے الفاظ بھی کوئی دنجو شکن منظر پیش نہیں کرتے۔ جید الکیوس
 دیہ قریب اعتدال، گنڈا، عالم جو صحت کا رہا، ذرے کا مادہ اس اپنے
 سارے نقش دھو، پھینک دے گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختہ،
 اقویا، تقویت کا یہ اثر ہو عام۔ جو ہیں برگ زرد، ہوں مقوی دل و
 جاں، مثل اوراق طلا، خدمت سرا، سعادت انتماء، دے اگر زاغ و
 زغن بیضہ رجون سیلاب کشتہ، مردہ دل زندہ ہوا، نیا قوتی، قوت فرا
 دتوا، جسم کو مل کے تو نے دھو دیا۔ جب وقت غسل، دل عدد
 کا تھا شقاوت سے جو سخت، برنگ سبک پا، خردہ گل، عشرت سرا،
 جوں موج تبسم، قہقہا، حلقہ، رقاصگاہ، دجا بجا، صحن چمن ہی میں،
 کیا، تماشا رقص کا، گلکاری کو دیکھ، فریا و سہا، صغ آتش باز، بارو
 کو پیسا تھا کیا، گلریز، ریزہ فولاد، گلہاٹے طلا، گنج چھٹے نھے، ہتھاب
 کے ہتھاب ہو، رنگ روئے مہ نقا، برج جو اڑ کر ہوئے، روشن کر دیا
 کہ اس کے رد برو، مطلق نہیں رہتا، ذوق کہتا ہے۔ اٹھا کر ذوق
 میں، شافی مطلق، اور رنج میں ہو مبتلا، سب کے سب ایک ناتواں
 شاعر کے رسالت قلم ہیں۔ اس میں لکھنے کی طاقت نہیں۔ معمولی شاعر
 بھی اس سے بہتر شعر کہہ سکتے ہیں۔ قافے تمام کے تمام ناقص ہیں۔
 زبان اور بیان کی صفائی مفقود ہے اور لہجہ متین و پروقار نہیں *
 دوسرے قصیدہ میں زمین ہی ایسی ہے کہ اس سے نظم میں روانی
 نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر آخری منزل پر پہنچ کر رگ جاتا ہے۔ مزے لیتا

تھا پڑے علم و عمل کے اپنے، دوسرا ہی شعر شاعر کی موزونی طبع کا
 غماز ہے۔ تصدیق صفت، ایک غیر موزوں ترکیب ہے۔ تمام قصیدہ پر
 نقد و نظر ناظرین کے لئے ہار خاطر ہو گا۔ یہی کہ دنیا کا فی ہے کہ اس میں
 بھی مذاق - تحریر - مضامین - اور لہجہ ہر حیثیت سے متعدد بد عنوانیاں
 پائی جاتی ہیں۔ شاعر نے بمشکل اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا یا
 ہے۔ گویا ہفتیوں طے کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ شاعری ذوق کی دسترس سے
 باہر ہے۔ آپ نے یوہنی شعر گوئی کی تکلیف گوارا فرمائی +

ذوق اور غالب کے سہروں پر عجیب و غریب تبصرے دیکھنے میں
 آتے ہیں۔ ایک نقاد لکھتا ہے کہ 'سہروں کا موازنہ اس وجہ سے نہیں کیا
 جا سکتا۔ کہ الفضل بل مقدم اس کا سہرا غالب مرحوم ہی کے سر تھا۔ لیکن
 موازنہ سے اس قدر گریز کیوں؟ ہم کہتے ہیں کہ اگر ذوق نے بہتر سہرا
 کہا۔ تو ان میں یقیناً اعلیٰ قوت تحریر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کو
 ماحول کے اثرات نے گمراہ کر دیا۔ اور وہ انشا کی طبع عمر بھر پر تصنع شعر
 کہتے رہے مگر ہمیں تو شکایت صرف اتنی ہے۔ کہ ذوق نے سہرا اچھا
 نہیں کہا۔ مولانا عبدالحی مصنف گل رعنا 'سہروں کا موازنہ فرماتے
 ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ 'سہرے میں مضامین ہلکے پھلکے اور زبان صاف
 سنجھی ہوئی ہونی چاہئے۔ اس سے آپ کی مراد یہ ہے۔ کہ ذوق میں
 یہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اور غالب میں نہیں۔ اس لئے ذوق کا
 سہرا غالب کے سہرے سے بہتر ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ اس استدلال
 کی رٹ سے اس کے برعکس نتیجہ نکلتا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر ثابت
 کریں گے۔ صاحب شعر الہند بھی تصدیق صفت ہو کر یہی رائے ظاہر

فرماتے ہیں۔ اور اپنی طرف سے مولانا طباطبائی مرحوم کے ادھورے موازنہ کی تکمیل فرما کر فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ کہ ذوق کا سہرا واقعی بہتر ہے۔ اصل یہ ہے کہ آزاد کی جادو بیانی نے لوگوں کی طبیعت کو اس قدر مسحور اور قوائے فکر کو اس قدر اغلوچ کر دیا ہے کہ وہ اسی کی بولی بولتے ہیں۔ وہ جو کچھ آزاد سے سنتے ہیں۔ اسی کو ناطق اور قطعی فیصلہ خیال کرتے ہیں۔

در پس آئینہ طوطی صفتم ز امشہ اند
ہر چہ استاد ازل گفت ہماں مے گویم

حقیقت میں غالب کا سہرا اپنے حریف کے سہرے سے بدرجہا بہتر ہے۔ دونوں میں کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ایک آسمان سے تو دوسرے زمین۔ ایک دن تو دوسرارات۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم اسلاف کے فیصلوں اور راؤں کو بلا چون دہرا تسلیم کر لیں رتفقہ کی روش بدل گئی ہے اور بتاتی ہے کہ جو کچھ اسلاف کہہ گئے ہیں یا ان کے جانشین آج کل کہہ رہے ہیں۔ اس کو پتھر پر لکیر مت سمجھو۔ جدید آئینہ، تنقید کی عینک لٹکا کر دیکھو تو تم کو دنیا ایک نئے رنگ میں نظر آئے گی۔

ذوق کے سہرے کا پہلا شعر قابل اعتراض نہیں۔ اگرچہ میں وسعدت خواجہ سرایانہ لفظ ہے۔ دوسرا شعر غیر مخلوط تخیل ہے۔ ذوق سادہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ کشتی سے تو مہ نو کی زریں کشتی۔ موتی ہیں تو انجم کے چمکدار موتی۔ معمولی چو ہیں۔ کشتی اور عام موتی شیخ کو پسند نہیں۔ شاعر کی طبیعت اصلیت سے کوسوں دور رہتی ہے

شیخ کی دنیا ایک خیالی دنیا ہے۔ تیسرے شعر میں خورشید سے تشابہ پیدا کر کے شعاعوں کی چمک کا مضمون پیدا کیا ہے۔ جو دوسرے شعر کی طرح بالکل تخلیقی ہے۔ صل علی اور سبحان اللہ۔ خوشاد خورشاعروں کی زبان ہے۔ لفظ نکھڑا اس طرح نظم ہوا ہے۔ کہ اس سے دنائت اور لجاجت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے الفاظ پر بیاضہ سودا کی وہ پھنٹی یاد آتی ہے جو اُس نے میر سوز پر کسی۔ یعنی میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومیاں آیا کرتی تھیں۔ یا تو جب یہ لفظ سنے تھے یا آج۔ بنے او بنی۔ اخلاص اور سورہ اخلاص! بھی اسی قسم کے لفظ ہیں۔ ساتویں شعر میں پھر غیر موزوں تخیل ہے یعنی سوئے فرخ سے انوار برستے ہیں۔ اور اس موہوم بارش سے ایک سہرا تیار ہوتا ہے۔ نویں شعر کی بندش ظاہر کرتی ہے۔ کہ ذوق کی قدرت بیان عوام الناس سے بھی کئی درجے ناقص ہے۔ تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا! الفاظ کی درست ترتیب یہ ہے کہ گوہر لے لے کر تیرا سہرا بنوایا ہے۔ ذوق نے تیرا اور سہرا میں بعد المشرقین پیدا کر دیا ہے۔ گوہر اور لے لے جدا ہو کر شعر کی موزونیت کو بیوندر زمین کر رہے ہیں۔ صد کا این گہر میں لفظ صد سے کثرت کا درست تصور نہیں پیدا ہوتا۔ بدھی اور کنگنا بنی اور بنے کے ہم جنس ہیں۔ کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا اس میں منہ کی تکرار معیوب ہے۔ دوسرے منہ کا کھولنا دہن کے کھلنے کا خیال بھی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے ناموزوں ہے پیرھویں شعر میں ناگوار تخیل ہے۔ دتما شایٹوں کا لفظ اس طرح بندھا ہے۔ کہ شعر میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم نظم کی کثرت سے جو سہرا

تیار ہوگا۔ اُس کا ذہن میں بھی تصور محال ہے۔ چہ جائیکہ وہ مصور ہو کر دکھائی دے، شاعر، جدید زمانہ کے تالہ دار اور فرمانبردار کا صحیح ترجمہ ہے۔ دوا سٹے تیرے ترا، زبان ہر لفظ پر رکتی ہے، دیرِ خوش آپ صفا ہیں، میں پھر ٹھیکل ہے۔ آخری شعر میں اپنے حریف کو اس قدر غیر موزوں لہجہ میں خطاب کیا ہے کہ ناظر کو شاعر کی بد تہذیبی نہایت ناگوار گذرتی ہے۔ اگر جس کو، کی جگہ جن کو، اُس کو، کی جگہ اُن کو۔ اور دیکھ، کی بجائے تو کیکھو، ہوتا تو شعر غالب کی سخن گسترانہ لاف کا ایک لطیف جواب ہو جاتا۔ لیکن ذوق شاعری اور طنز سے ناواقف ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں اس قسم کی معنوی نزاکتیں نہیں پیدا کر سکتے۔ ظاہری شعبہ جس قدر چاہو چشم زدن میں مہیا ہو سکتے ہیں۔

اب غالب کے سہرے کی طرف آئیے۔ طباطبائی نے کہا ہے کہ سہرا باندھنا، محاورہ نہیں۔ آپ جیسے لسانیات کے ماہر سے یہ اعتراض فی الواقع تعجب انگیز ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ سہرا یمن و سعادت کا سہرا ہو، یہ تو محض ٹھیکل ہے۔ اور اگر رنگین محاورہ بھی ہے۔ تو کیا سہرا باندھنا اذو کے دوزمرہ کا ایک سادہ محاورہ نہیں؟ پھر دیکھئے کہ جہاں ذوق نے مقطع میں مہذب لہجہ نہیں اختیار کیا وہاں مطلع میں بھی درست انداز نہیں اختیار کیا۔ جواں بخت کو نام لے کر خطاب کرنا بے ادبی ہے۔ غالب نے اُس کو شہزادہ کہہ کر خطاب کیا ہے اور مدوح کے مرتبہ کے ساتھ تہذیب کا خیال بھی رکھا ہے۔ دوسرے شعر میں لکھڑے، نہایت بیجاختہ طور پر استعمال ہوا ہے۔ لفظ لہڑ فصیح نہیں۔ غالب نے اس کو نمبر برترجیح دی۔ اور محبت ذوق کا

ثبوت دیا۔ کیونکہ لفظ مبرانتا غیر فصیح لفظ نہیں کہ اس کا استعمال معیوب قرار دیا جاسکے۔ یہ غالب کی قادر الکلامی کی بین دلیل ہے کہ اُس نے ایک معمولی لفظ استعمال کر کے شعر کو پست نہیں ہونے دیا۔ ذوق کی بے طو تحقیق کے بعد غالب کا ایک صاف سادہ شعر ملاحظہ ہو۔

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی

ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لٹا کر سہرا

پانچویں شعر میں 'موتی' کی تکرار اچھی نہیں۔ اور مضمون میں بھی تکرار ہے۔ پھر بھی ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان سے شاعر کی بدلتی نظر نہیں ہوتی۔ چھٹے شعر میں تختی ہے۔ گریبان نہایت صاف ہے اس سے شعر کا اثر زایل نہیں ہوتا۔ پسینے کا مضمون اچھا نہیں۔ اس سے آئے تمام شعر شستہ اور لطیف ہیں۔ صرف گیارہویں شعر میں تختی ہے یہاں بھی تحریر شگفتہ ہے۔ اس لئے غالب کے ملاقی سخن پر حرف نہیں آتا۔

غرض لطفِ معنی اور حسنِ تحریر کے اصولوں کے سامنے رکھا جائے تو دونوں شاعروں کے سہروں میں کوئی مناسبت ہی نہیں معلوم ہوتی ایک آتش خاموش ہے۔ تو دوسرا موجِ دغاں۔ ایک شاعر اعلیٰ علیین پر پہنچا ہوا ہے تو دوسرا اسفل السافلین میں غرق ہے۔

ہم نے ذوق اور غالب کے سہروں کا مقابلہ ایک ایک شعر لے کر کیا ہے۔ یہ طرزِ تنقید صرف ان لوگوں کی تسکین کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ جو ظاہر پرست ہونے کی وجہ سے مفرد اشعار کے موازنہ سے نتائج اخذ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ مگر تجزیہ سے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہئے

ہیں۔ اگر آزادانہ تنقید سے کام لیا جائے۔ جس کو ہم اردو میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ تو دونوں نظموں کو سامنے رکھ کر کہا جاسکتا ہے۔ کہ ذوق کی ذہنیت۔ تخیل۔ عامیانہ زبان اور معمولی اسلوب بیان کی طرف مایل ہے۔ اس لئے اُن کی نظم بلند پایہ نہیں۔ غالب کے بہرے میں حقیقی شاعری کی بہت سی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے وہ ایک اچھی نظم ہے۔

ذوق کے تضاد کا عمیق مطالعہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ ادبی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ وہ نقاد جو ان کو بلند پایہ خیال کرتے ہیں ہم کو نئے زمانے میں پرانی باتیں سناتے ہیں اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے اب اُن کی شنوائی ناممکن ہے۔



چھٹا باب

ذوق اور غالب

اگر کسی شاعر کا کلام وسیع ہے تو وہ نوع انسان کا محسن ہونے کی حیثیت سے قابل احترام ہے۔ اگر نہیں تو وہ عام انسانوں کی طرح غیر معروف رہے گا۔ جہاں تک ہم نے ذوق کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر نہیں۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے آپ کی سوانح عمری، ماحول کے اثرات، ذہنیت اور آرٹ کی نوعیت ملاحظہ کی ہے۔ اب ہم آپ کی شخصیت اور فن پر مجموعی عیثیت سے نظر ڈالتے ہیں۔ ذوق کے سوانح حیات ہمارے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ چونکہ آپ کی شخصیت میں تنوع نہیں۔ اس لئے آپ کے حالات زندگی بھی چند معمولی واقعات پر مشتمل ہیں۔ شیکسپیر، سرسید، میر تقی، غالب اور اقبال کی زندگی کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ جس طرح آتھیلو، لیر، ہیلٹ اور شہر زاد دنیائے افسانہ کے دلچسپ افراد ہیں۔ اور ان کی شخصیت کا مطالعہ مفید اخلاقی اثرات کا حامل ہے۔ اسی طرح مشاہیر و باو شعرا نیز دی افسانہ کے مقتدر افراد ہیں۔ اور ان کی روشنی سیرتوں کا مطالعہ نہایت بصیرت افروز ہے۔ جتنا کوئی انسان بڑا ہوگا۔ اتنی ہی اس کے

اثرات میں وسعت اور گیرائی ہوگی۔ ذوق کے سوا بخ حیات و ولادت
 زندگی اور موت کے علاوہ کسی اور قابل ذکر واقعہ یا خصوصیت پر ناز نہیں
 کر سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُن کی شخصیت بلند پایہ نہیں ہے۔
 ذوق نے اپنے ماحول کے بہترین اثرات قبول نہیں کئے۔ آپ حافظ
 عرفی، نظیری، بیدل اور میر کے بلند مذاق اور سنجیدہ شاعری سے متنفر
 رہے۔ شیخ کے ماحول نے اُن کو مسخر کر لیا۔ وہ اپنے ماحول کو مغلوب نہ کر
 سکے شیخ خود روشنی طبع کے مالک نہیں۔ اس لئے آپ کی شخصیت سے دنیا
 کو کوئی معنوی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

شیخ کا مذاق بہت پست ہے۔ اُن کی طبیعت مردانہ جذبات سے
 آشنا نہیں۔ وہ تواتر رقیق حسیات اور نسوانیت کی طرف مایل ہے شیخ
 کے ملکات میں تنوع اور بلندی نہیں۔ بلند تخیل کی بجائے وہ تخیل جیسی ادنیٰ
 قوت کا مالک ہیں۔ جدت، ظرافت اور تفکر اُن کے لئے شجر ممنوعہ کا
 پھل ہیں۔ اُن کے جذبات ہنڈیل خیالات پامال اور شاعری میں اثر
 آمیز باتیں کم ہیں۔ وہ اخلاقی، ناصحانہ، مذہبی اور عشقیہ مضامین قلمبند
 کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی اس قدر وقیع نہیں۔ اُن کے اخلاقی اشعار عام افلاق
 سے اُگے نہیں بڑھتے۔ ناصحیت ہمیشہ بے اثر ثابت ہوتی ہے۔
 کیونکہ یہ ہمیشہ شعریت سے بیگانہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ذوق کی
 نصیحتیں بھی عام سطح سے زیادہ بلند نہیں۔ اُن کا مذہب عوام کا
 مذہب ہے۔ باقی رہے عشقیہ مضامین تو اُن میں اُس وقت تک
 وسعت نہیں پیدا ہو سکتی، جب تک شاعر ایک حقیقی عاشق نہ ہو۔
 ذوق کی طبیعت میں اس قدر دلولہ اور جوش کہاں کہ وہ امراء القیس

اور کیٹس کے ماہمنوا بن سکیں؟ چند عشقیہ اشعار اتفاقاً موزوں ہو گئے ہیں۔ اور وہ بھی اس قدر بلند نہیں۔ شیخ ایک نہایت معمولی ہوس پیشہ فائن تھے۔ اس لئے ہم اُن سے حافظ جیسی ہندب محبت تو کیا حسرت اور موت جیسے معمولی شاعروں کی عام محبت کی توقع بھی نہیں کر سکتے۔

فلسفہ اور تصوف ذوق کی شاعری کے لئے حلقہ پیردن در کا حکم رکھتے

ہیں۔ جو کچھ وہ ان موضوعات کے متعلق کہتے ہیں۔ دلی زبان اور اوپر سے دل سے کہتے ہیں۔ اُن کے معنیات معمولی۔ تجربہ زندگی محدود اور بشریت ناقص ہے۔ وہ ایک بلند نظر انسان نہیں۔ اُن کے عادات و خصایل۔ اور خیالات عام انسانوں کے ہیں۔ مختصر یہ کہ ذوق کی شخصیت بلند نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ نے ہمیں کوئی خاص پیغام کیوں نہ دیا۔ یا قبائل اور غالب کی باؤں فلسفیانہ اشعار کیوں نہ کیے۔ لیکن ہم ہر برگزیدہ شاعر سے توقع کرتے ہیں۔ کہ اُس کے کلام میں کچھ ایسی مفید باتیں ہوں۔ جو ہمیں بہتر بننے میں مدد دیں یا کم از کم ہمارے فطری جذبات ہی کی ترجمانی کریں۔ ذوق کی شاعری کا اصلیت اور زندگی کے ساتھ تعلق بہت ہی معمولی ہے۔ اس کا تہذیب و تمدن اور تعلیم پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑ سکتا ان وجوہات کی بنا پر ہم شیخ کو ایک بڑا شاعر یا بڑی شخصیت تسلیم نہیں کرتے۔

ذوق کی زبان نہایت فرسودہ اور عامیانا ہے۔ اُن کو خیالات کے ادا کرنے پر کوئی قدرت نہیں۔ اُن کی قوت بیان بہت معمولی ہے فن کے لحاظ سے وہ اُن تمام لغزشوں کا شکار ہوئے ہیں۔ جو کسی شاعر کے کلام کو فصاحت و بلاغت کے درجہ سے گرا دیتی ہیں۔ مختصر یہ کہ زبان اور قوت تحریر کے نقطہ نظر سے بھی ذوق کی عظمت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

آپ پوچھیں گے کہ اگر شیخ کی شاعری اتنی ہی پرست ہے۔ جتنی کہ ہم نے ظاہر کی ہے۔ تو ان کو اتنی شہرت کیوں حاصل ہوئی اور وہ آج تک بعض ادبی حلقوں میں احترام کی نظر سے کیوں دیکھے جاتے ہیں؟ ان کی شہرت کی وجہ ذوق عامہ کا عروج ہے۔ جس کا زور آج تک نہیں ٹوٹا۔ یہی وجہ ان کی گذشتہ مقبولیت کی ہے۔ اور یہی آج ان کی شہرت کو عوام میں بکرا رکھ رہی ہے۔ نقاد شیخ کی سادگی پر بھولے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی شخصیت ہے۔ جو باقی سب برائیوں کو گوارا بنا دیتی ہے۔ تنقید نگار ذوق کے کلام کو آسان دیکھ کر خیال کرتے ہیں کہ واقعی قابل قدر اور پر عظمت بھی ہے۔ ذوق کے بعض اشعار اتفاقاً بلند نکل آئے ہیں۔ اس لئے نقاد حضرات کی گمراہی اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ وہ ان اشعار سے مرعوب ہو کر ذوق کے عام کلام کو حقیقی معنوں میں سادہ اور بلند پایہ خیال کرتے ہیں۔ اور اس کا وقت نظر سے مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ذوق کے موعودہ مداح جن میں زیادہ تعداد اہل زبان کی ہے۔ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم روایات، اخبار کا تواتر اور عام مذاق انہیں شاعر کے کلام کا آزادی سے مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر وہ اصول فن کو سامنے رکھ کر محققانہ بے تعصبی اور وارستگی کے ساتھ ذوق کی شاعری کا مطالعہ کریں۔ تو سادگی کا سراپا ان کو پریشان نہیں کر سکتا۔

دوسری بات جو نقادوں کو گمراہ کر رہی ہے۔ ان کا غلط طرز تنقید یا طرز نگاہ ہے۔ اس موضوع پر ہم آگے بہت کچھ کہ چکے ہیں۔ یہاں اس بات پر پھر زور دیا جاتا ہے۔ کہ کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت اس کے بلند اشعار پر تنقید کی بنیاد نہیں رکھنی چاہئے۔ اگر شخصیت کا

مطالعہ نہیں۔ تو کم از کم اتنا تو ضرور دیکھنا چاہیے کہ اُس کا مذاق کیا ہے۔ اگر اُس کا مذاق ہی درست نہیں۔ تو اُس کے اشعار کی عمدگی پر زور قلم صرف کرنا بے سود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر کے کلام میں نقائص اور پست اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن سوال صرف نقائص اور پست اشعار کا نہیں۔ بلکہ اُن کی قلت و کثرت کا ہے۔ اگر کسی شاعر کے کلام کا زیادہ حصہ ناقص ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے چند اچھے شعروں کی بنا پر اُس کو ایک برگزیدہ شاعر قرار دیا جائے۔ قادر الکلامی ایک بڑی بات ہے۔ ذوق کی شاعری کی تو یہ حالت ہے۔ کہ بلند اشعار کا معیار بھی سامنے رکھا جائے۔ تو وہ اُس پر بھی پوری نہیں اترتی۔ ذوق کی شاعرانہ استعداد کو بدلتا مل تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کی شاعرانہ قوتیں نہایت معمولی ہیں ہمارا خیال ہے کہ اگر اُن کی جلی قوتوں کو نشوونما پانے کا موقع ملتا۔ تو ذوق پھر بھی ایک اعلیٰ شاعر بن سکتے۔

اگر ہمارے نقاد معقول اصولوں سے ذوق کے کلام کو پرکھیں تو یقین ہے کہ وہ بھی کم و بیش اُنہی نتائج پر پہنچیں گے۔ جن کا ہم نے اظہار کیا ہے۔ رسالہ اردو کا گمنام نقاد لکھتا ہے کہ

”میر اپنے واردات قلبی و جذبات اندرونی کی تصویر کھینچتا ہے اور اس رنگ میں اُس کا کوئی جواب نہیں۔ اس بنا پر اسے سب نے استاد مانا ہے۔ درد نے تصوف کے مضامین بطور واردات باطنی کے بیان کئے ہیں۔ اس لئے وہ بھی مقبول ہوا اور اُس کی شاعری بھی آج تک زندہ ہے۔ سودا نے غزلگوئی میں داخلی شاعری کے ساتھ خارجی شاعری کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس لئے میر کی غزل کے سامنے اُس کی غزل

زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ جرأت نے معاملہ بندی اختیار کی۔ حال میں داغ نے اس رنگ کو بہت ترقی دی اس بنا پر دونوں کی شاعری مقبول ہوئی۔
 ناسخ نے اپنی غزلگوئی کی بنیاد خارجی مضامین پر رکھی۔ اور صائب کی مثالیہ شاعری کا تتبع کیا۔ اس لئے وہ مقبول نہ ہو سکی۔ آئرش نے باطنی خیالات کی جھلک جس قدر دکھائی ہے۔ اُسی قدر اُس کے کلام کو قبول عام نصیب ہوا۔ لکھنؤ کے شعرا میں رند نے سب سے زیادہ اس کا لحاظ رکھا۔ اس لئے اُس کی شاعری کی بہت شہرت ہوئی۔ انشائے مسخرے بن اور بیراہہ روی میں اپنی شاعری کو برباد کیا۔ ذوق اور نصیر نے برخلاف دہلی کے شعرا کے سنگلاخ زمینوں پر توجہ کی اور خارجی مضامین سے اپنی غزلوں کو بھر دیا ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری میں زندہ رہنے کی قابلیت نہیں ہے۔ ذوق کے ہاں داخلی شاعری کے مضامین بھی جہ جہ پائے جاتے ہیں۔ مگر غالب رنگ خارجی شاعری کا ہے۔

ذوق کی غزلگوئی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ عام زبان کے اکثر محاورے شاعری میں سما گئے۔ مگر نفس شاعری کو کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے غالب یا مومنؒ خیالات کی طرف متوجہ ہیں۔ وہ اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ خیالات عام بول چال میں ادا کئے جائیں۔ یا اُن کے لئے کئی ترکیبیں ایجاد کرنی پڑیں۔ بلکہ غالب تو عام طور پر زبان کے عام محاوروں سے اپنا دامن بجاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شاعری کی دنیا میں غالب کے تخیل نے بہت وسعت پیدا کر دی ہے۔ برخلاف اس

۱۔ جرأت اور داغ حقیقی جذبات سے بہت کم کام لیتے ہیں۔
 ۲۔ غالب کی معنی نوازی مسلم۔ مگر مومن کی لکنتہ سخی مستثنیٰ۔ غادر۔

کے ذوق نے شاعرانہ تخیل کی جولاں گاہ کو وسیع کرنے میں کوئی مدد نہیں کی
 ذوق نے یوں چال کی زبان شاعری کی دنیا میں روشناس کی۔ لیکن
 اس طرز کا خیالات کی جدت اور تخیل کی بلندی سے کوئی واسطہ نہیں
 اس انداز سے بھی شاعری کے میدان میں کوئی وسعت پیدا نہیں ہو سکتی
 عوام کے عقاید و رسوم اور معتقدات سے شاعری کو چنناں فائدہ
 نہیں پہنچتا۔ جب تک شاعر اپنے اعلیٰ تخیل کو اس سانچے میں نہ ڈھالے
 ذوق دور جانا اور بلند اڑنا پسند نہیں کرتا۔ نہ قلب کی گہرائی میں غوطہ
 لگا کر کسی نفسی واقعہ کا سراغ لگاتا ہے۔ غالب اپنے ہم عصر شاعروں
 کی فضائے خیال سے بہت اونچا اڑتا ہے۔ اور کسی ایسی نفسی کیفیت کو
 شکار کرتا ہے۔ جس پر عام لوگوں کی نظر کم پڑتی ہے۔ دونوں شاعروں
 کی دماغی رفتاروں کا مقابلہ کرنے سے ہر ایک کی شاعری کی حقیقت
 کھل جاتی ہے۔ اور صاف نظر آتا ہے۔ کہ ذوق شاعرانہ تخیل میں غالب
 کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

ذوق کی غزل کے معنایں غزلیت سے بہت دور ہیں۔ ان میں
 عاشقانہ جذبات ہی باندھے گئے ہیں۔ جیسا کہ عام شعرا کا دستور ہے
 نہ ان سے روحانی واردات کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسا کہ صوفی شعرا کا طرز
 ہے۔ نہ ان میں حکیمانہ خیالات کا چرہ اُٹا را گیا ہے۔ جیسا کہ فلسفی شعرا
 کا آئین ہے۔ نہ فطرت انسانی کی کوئی گہری کیفیت بیان کی گئی ہے
 جیسا کہ بلند خیال فطرت نگاروں کا وتیرہ ہے۔ پھر وہ کیا چیز ہے۔ جس کا
 بنا پر ہم ذوق کی غزل گوئی کو شاعری کی دنیا میں وقعت اور عزت کی
 نظر سے دیکھیں؟ خارجی مضامین ضرور ان میں ہیں۔ جو غزل کے موضوع

سے خارج ہیں۔۔۔۔۔۔ اُس کو فرصت نہیں کہ فطرت میں بیٹھ کر فطرت انسانی کی گہرائیوں پر نظر ڈالے۔ اور اُن بہروں کی دلفریب رفتار کا غور سے مطالعہ کرے۔ جو دل کے سمندر میں اٹھتی رہتی ہیں اور جن کا نقشہ کھینچنا غزل گو شاعر کا فرض ہے۔ یہ تیر ہی کا کام تھا جس کو باوجود دوبار لکھنؤ سے وابستہ ہونے کے دربار داری سے نفرت تھی۔ جو اپنے مکان کے بالاخانے کا در چہ کھل کر پانیوں باغ پر نظر نہیں ڈالتا تھا۔ کیونکہ اس کے دل کے دریچے ٹھیلے ہوئے تھے۔ اور ابد باغ نہیں فطرت انسانی کے ہزاروں باغ اُس کی نظر کے سامنے تھے۔ اور وہ رات دن چشم بصیرت سے اُن کے نظارہ میں محو رہتا تھا۔ عرقی نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا ہے۔ کہ اگر میں سرو و سمن کی محبت سے دل بہلا نا چاہتا ہوں تو چین کا تھک پڑ کر اسے اپنے گھر لے آتا ہوں۔ یہ بدل بھی اس علم کو دیکھ کر وجد میں آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تو غضب کی بات ہے۔ کہ سرو و سمن کا تماشا دیکھنے کی آرزو تیرے دل میں پیدا ہو۔ اے انسان تیری فطرت تو بہت بند ہے۔ کیا تو غنچہ سے بھی کم پیدا ہوا ہے۔ کہ یہ آرزو تیرے دل میں پیدا ہو؟ دل کا دروازہ کھول اور چین میں داخل ہو جا۔

ذوق میں غزل گوئی کی قابلیت ضرور تھی۔ مگر خاص اسباب تھے۔ جن کے سبب یہ قابلیت مضاعف ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ فنا ہو گئی۔

اس تنقید کے بعد ہم ذوق کی شاعری اور شخصیت پر مزید تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ اُن کے کلام میں کچھ اچھی خصوصیتیں یا دیوان میں اچھے شروبو جو ہیں تو ہوں۔

لہ اس سے ہمارے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ اگر ذوق نے دوبار کے اثرات قبول کئے۔ تو یہ زیادہ تر اُن کی اپنی فطرت کا نتیجہ تھا۔ دوبار کی زندگی کو اس میں زیادہ دخل نہیں ہے۔ یہ جزو درست ہے۔ کل نہیں کیونکہ شاعر کے لئے فطرت کا مطالعہ ضروری۔

اتنا ظاہر ہے کہ ان کی شخصیت شاندار نہیں۔ آخر ذوق کے مداح اس اعتراض کا کیا جواب دیتے ہیں کہ ان کی شاعری کا مقصد کیا ہے؟ کوئی خاص پیغام نہ سہی۔ لیکن کم از کم اتنا تو ہو کہ ان کا کلام کسی معنوی فائدہ کا حامل ہو۔ ذوق کی شاعری میں یہ خصوصیت منقاع ہے۔ اس لئے وہ ایک ادنیٰ شاعر اور ادنیٰ ہستی ہیں۔

ذوق کا سودا۔ انشا۔ میر اور دیگر قدیم شعرا سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں ان کا مسئلہ حریف غالب ہے۔ شاعرانہ قابلیت کے لحاظ سے دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ لیکن چونکہ زبان کی کم نظری نے دونوں کو حریف ہمدرگ بنا دیا ہے۔ اس لئے ہم اس ویرینہ نزاع کا تصفیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ذوق اور غالب دونوں میں کس کی افضلیت کا شرف حاصل ہے۔ اور کیوں۔ ذوق کے شاعرانہ مرتبہ کی نسبت سطور بالا اور گزشتہ صفحات ایک مضمّن تخیل ہیں جس کی تشریح یہ ہے کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر نہیں۔ اب غالب کی طرف آئیے۔ غالب کی شاعری پر تنقید کرنے والے ان کی شخصیت کو بالکل چھوڑ جاتے ہیں۔ گویا یہ ان کے نزدیک قابلِ مطالعہ نہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ تنقید کا مقصد ہی شخصیت کی توضیح ہے۔ خود فن کا منتہا ہے مقصود قدرت اور وجود باری پر غور و فکر کے ساتھ انسان اور اس کے متعلقات پر خیال آرائی ہے۔ آرٹ انسانوں کو آپس میں روشناس کرتا ہے۔ اس لئے تنقید کا نصب العین بھی شخصیت کا مطالعہ ہونا چاہئے۔ اب تک غالب پر جتنے تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی ذہنیت۔ ملکات اور دل و دماغ پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں۔ مولا زاحالی کی تعریف کرنی چاہیے کہ آپ نے غالب کے عادات و خصائل کو اس نفاس سے

دافع کیا کہ آج مرزا ہم کو ایک جانے پہچانے ہوئے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ گویا ہم نے ان کی سیرت کا مطالعہ پریم چند کے کسی ناول میں کیا ہے۔ مگر فوس عالی نے مرزا کے تخیل، شخصیت، افکار و عقاید اور ملکات پر نظر نہیں ڈالی اور آپ کے مشکل اشعار کا حل اور خوبیاں بنانے پر اکتفا کی۔ آپ جیسا نکتہ رس نقاد اس کام کو انجام دیتا۔ تو آج اس کام کے لئے مزید تصانیف کی ضرورت نہ محسوس ہوتی۔

بجنوری مرحوم کا بھلا ہو۔ ایک زندہ جاوید کتاب یادگار چھوڑ گئے۔ آپ نے غالب کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور دیگر نقادوں کو تنقید عالیہ کا راستہ دکھایا۔ معترض کہتے ہیں۔ کہ آپ نے مرزا کی شاعری میں وہ باتیں ظاہر کی ہیں جو دراصل اس میں موجود نہیں۔ یعنی غالب کی شخصیت میں بجنوری کی روح کا حل ہوا گیا ہے۔ مگر روانی تنقید کو اعتدال سے کیا تعلق؟ تنقید بھی ایک فن ہے۔ اور اپنے اظہار میں لاتین ہے۔ اگر جو ش عقیدت یا تخیل کی لہر میں نقاد کچھ ایسی باتیں بھی کہ گیا جن کو عقل کی روایتی سرد مزاجی درست تسلیم نہیں کرتی۔ تو چشمہ آفتاب را چہ گناہ؟ بجنوری نے مرزا کی شاعری کی نسبت جو کچھ کہا، بڑی حد تک درست ہے۔ البتہ بعض اشعار ایسے ہیں جن میں زبردستی ایسے معنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو شاعر کے دہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ اس طرح بعض خصوصیتوں کے بیان میں شوق رنگوں سے کام لیا گیا ہے اور واقعات کی تصویر پر ہوا دھم کے ساتھ کھینچی ہے۔ غالب یقیناً ترنم میں حافظ شیراز کی موسیقیت کو نہیں پہنچتا۔ شکیپر سے مقابلہ غیر منصفانہ اور در غیر ناقدانہ ہے۔ غالب کے ذوق اشعار اتفاقی ہیں۔ وہ مرزا کے آئینہ سخن

کے مستقل جوہر نہیں۔ بایںہمہ فاضل نقاد نے شاعر کے افکار و داعی -
 خیالات و عقاید اور طبیعت کے بعض پہلوؤں پر جو الفیا روشنی ڈالی ہے
 نہایت بصیرت افروز ہے یہ ہماری زبان میں شخصیت کا سب سے
 پہلا مطالعہ ہے۔ تنگی جانے معنوں نگار کو اخلاص نہیں دی کہ وہ غالب
 کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالے۔ ورنہ آج تنقید غالب تشنہ
 نگین نہ ہوتی۔

مولانا غلام محی الدین زور جو غالباً 'آرگس' کے مصوری منظر ہیں۔
 مرزا کی ذہنیت میں رشک کا عنصر سب سے زیادہ دیکھتے ہیں۔ اہل تنقید
 کو نظریوں سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ اور شاعری فطرت کا وسیع نظری کے
 ساتھ مطالعہ کرنا چاہئے۔ جناب زور نے ایک نظریہ سوچا ہے اور مرزا
 غالب کو شکار کرتے کرتے آپ اپنے نظریہ کا شکار ہو گئے ہیں یہیاد
 آپ حلقہ ادب ستم بھی آپ۔ اب سوال یہ ہے اگر غالب کی طینت میں
 صرف رشک و حسد ہی کی گنجائش تھی۔ اور باتوں کو اس میں کوئی دخل
 نہ تھا کیا ان میں تنحیل۔ عقل و فہم۔ عادات۔ مذاق۔ احساس۔ تجربہ۔
 شوخی۔ زنا فدانہ قوت۔ اور اس قسم کی دیگر قوتیں بالکل مفقود تھیں؟
 شاعر کے حکیمانہ خیالات۔ عاشقانہ جذبات۔ اور صوفیانہ عقاید۔ کیا
 برب معمولی باتیں ہیں۔ کہ ان کا مطالعہ نہ کیا جائے؟ جناب زور کی کوتاہ
 نظری ہے کہ وہ شاعر کی طبیعت میں رشک کے سوا اور کوئی خصوصیت
 نہیں دیکھتے۔ بالضرر الہیہ ثابت بھی ہو جائے۔ کہ مرزا جسم رشک و حسد
 تھے تو کون ہے جو اس کو ایک اعلیٰ مطالعہ کہے؟ اور کون ہے جو حضرت
 زور کو ایک پختہ کار نقاد تسلیم کرے؟ اس سے تو خود نقاد کی ذہنیت

شک و شبہ کا محل بن جاتی ہے۔ کیا وہ انسان خود حاسن و سرشت کا مالک نہیں۔ جو اور سب باتوں کو چھوڑ کر شاعر کی طبیعت کے ایک ادنیٰ پہلو کو پیش نظر رکھتا ہے؟ پھر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ مرزا کو کس لئے شک و حسد کا پتلا قرار دیا جا رہا ہے۔ کیا دیگر شعرا نے شک و رقابت کے مضامین قلمبند نہیں کئے؟ اگر غالب نے ان کو زیادہ تعداد میں بانہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اور سب شاعروں سے زیادہ صاحب تخیل ہیں۔ وہ شک کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔ اور چونکہ غزل ان کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ شلیکسیر کی مانند آہستہ آہستہ کثیر تخیل کریں۔ وہ انسانی فطرت کے مطالعات کو مفرد اشعار کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اگر نقاد حضرات ہر جہت پر اس کو خواہ مخواہ شاعر کو رسوا کریں تو اس میں اس کا کوئی تصور نہیں۔

دیوانہ غالب کے لطیفی ایڈیشن میں بلاشبہ بعض ایسی باتیں بھی گئی ہیں۔ جن کو استاد ذوق کی بے سرو پا ناز کشیاں کہنا چاہیئے۔ ان کی بنیاد تماثر قیاسات۔ ناممکن قیاسات پر ہے۔ جو شخص قدر کو رستخیز نیجا کہتا ہے۔ نہ کوئی سیاسی خیالات رکھتا ہے۔ نہ ان کا اشعار میں اظہار کر سکتا ہے۔

پروفیسر محمد بن تاثیر فرماتے ہیں۔ کہ وہ گن کے ایک نقاد نے غالب کی شاعری کو ایک انگریز نقاد کے نظریہ شعری سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کو تحت الشعری سے بھی نیچے گرا دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر غالب

کی شاعری کا اس نظر کی رو سے سوچ سمجھ کر مطالعہ کیا جائے۔ تو ہم سید عبداللطیف سے بالکل برعکس نتائج پر پہنچیں گے۔ سید صاحب کی تنقید یوں تو بہت غلط ہے۔ پھر بھی آپ نے بعض باتیں درست فرمائی ہیں۔ آپ کی رائے میں غالب کی شاعری بالکل عقلی اور تخیلی ہے۔ اس لئے آپ ایک بڑے شاعر نہیں۔ جو مثالیں اس دعویٰ کی تائید میں پیش کی گئی ہیں ان کو ہر صاحب ذوق درست تسلیم کرے گا۔ ہمیں آپ کی پیش کردہ مثالیں یاد نہیں۔ اس لئے ہم ذیل کے اشعار اپنی طرف سے نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

آمد سید لاپ طوفانِ صدائے آب ہے نقشِ باجوکان میں دکھتا ہے انگلی جاوہ سے
مقدم سید لب سے دل کی ناشائستگی ہے خاندانِ عاشقِ مگر سازِ صدائے آب فنا
شبِ غما رِ شوقِ ساقی رِ تخیلِ اندازِ تھا تا محیطِ یادہ صورتِ تخیلِ خمسیا زہ تھا
دماں ہر بیتِ پیغامِ جوازِ نجرِ رسوائی عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی
بس کہ ہوں غالبِ اسیری میں بھی آتشِ نیرِ پیا
موتے آتشِ دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

ان اشعار میں کوئی جذبہ نہیں۔ کوئی عمیق معنی نہیں۔ ذوق کی مانند بے ثریا خیالات ہیں۔ جن کو عقل کی مدد سے الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ غالب کے بہت سے اشعار اس قسم کے ہیں۔ کیا ان اشعار کی بنا پر غالب کی شاعری کو اکتسابی قرار دیا جاسکتا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اور اس پر مرزا کے بقائے دوام کا دار و مدار ہے۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو کہ غالب کی شاعری وہی ہے۔ اور تخیل سے پیدا ہوئی ہے۔ ہم کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اگر ذوق کی مانند مرزا بھی عقل و شعور کی مدد سے شعر کہتے ہیں تو ان

کی شہرت کبھی پایدار نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کی شاعری فلسفیانہ ہے تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ شاعر کی فلسفیت نے اس کو غیر متخیل نہ تو نہیں بنا دیا۔ کیا اس خصوصیت کی وجہ سے اُس کے مخاطب قلیل ہو گئے ہیں یا نہیں؟ اگر قلیل ہیں تو اس کا اُس کی عظمت پر کیا اثر پڑا ہے؟

ان سوالات کا جواب دینے سے پیشتر چند امور کا تصفیہ ضروری ہے۔ یعنی شاعر کسی زمانہ میں ظہور پذیر ہوا۔ ماحول کی مجبوریاں اُس کے تخیل اور طبیعت پر کس حد تک اثر انداز ہوئیں۔ وہ اپنے عہد کی عام سطح سے کس قدر اونچا اڑا۔ کیا اُس میں جدت کا مادہ تھا؟ کیا اُس نے اپنی شخصیت کے اظہار کی کوشش کی؟ بالفرض اُس کا فن نہایت ناقص ہے۔ کیا وہ اس کے باوجود اپنی شخصیت واضح کرنے میں کامیاب ہوا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی شاعری کے نقائص اس کے ماحول کا نتیجہ ہیں یا اس کی ذات سے مخصوص ہیں۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ جدید غزلگوں کی شاعری۔ تعلیم و تربیت کی سہولت اور بصیرت افزائی کے باوجود کن عیوب کی حامل ہے۔ اور غالب کی شاعری کے مقابلے میں کیا مثبت رکھتی ہے۔ اگر مرزا غالب اپنے ماحول کی مجبوریوں کے باوجود تغزل کے اُس مقام پر پہنچے جہاں جدید شاعر بہترین تعلیم کے باوجود نہیں پہنچ سکے تو ہمیں شاعر کی غیر معمولی عظمت تسلیم کرنی پڑے گی۔

غالب کی شاعری تمام کی تمام انسانی یا عقلی نہیں۔ سید عبداللطیف نے بہت غلطی کی کہ اس کو سراسر عقلی و تکنیکی قرار دیا۔ سید صاحب کا مذاق سادہ شاعری کی طرف مائل ہے۔ لطیف متخیل نہ شاعری سے آپ کو کوئی مناسبت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اقبال کی شاعری کو پسند نہیں کرتے

غالب کی شاعری کی داد دینے کے لئے لطافت اور رنگینی کو پسند کرنے والا مذاق چاہیئے۔ سیار عبداللطیف، عالی اور شبلی کا طرز پسند کرتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ اقبال اور غالب کی شاعری کو الکتسابی اور پُر تکلف قرار دیں، تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔

غالب کی شاعری فلسفیانہ ہے، فلسفہ ہمیشہ عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ غالب نے حقائق و معارف کا ادراک اپنی زبردست قوت فکر ہی کی بدولت کیا۔ لیکن اُس کے بلند خیالات خشک عبارت میں ادا نہیں کئے گئے جتنی شاعر کی قوت فکر اعلیٰ ہے اتنا ہی اس کا تخیل پر شوکت ہے۔ اس لئے وہ اپنے فلسفہ کو شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ دنیا کے بہت کم شاعروں نے فلسفہ جیسی خشک چیز کو مرآ سے بہتر انداز میں نظم کیا ہے۔ اُن کی فطرت مراسر شعر ہے۔ اس لئے اُن کے حکیمانہ خیالات بھی شعریت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ اُن کو نثر کی بے کیف زبان میں پیش نہیں کرتے۔ بلکہ شاعرانہ اور مصورانہ انداز میں جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً

حنائے پائے خروں ہے ہمارا اگر ہے یہی دوام کلفط خاطر ہے عیش دنیا کا
سری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی بیہولی برق خرمن کا ہے خون گرم ہفتا کا
ہے تجلی تری مسلمان وجود ذرے پر تو خورشید نہیں
آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز ہمیشہ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھروسے میں جس قدر جام و سب میخانہ عالی

اس قسم کے اشعار کی تعداد جتنی چاہو بڑھائی جا سکتی ہے۔ ان سب میں فلسفیانہ خیالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ مگر ساتھ ہی شاعری کو ہاتھ سے نہیں

جانے دیا۔ یہ غالب ہی کا دم تھا کہ آپ نے اس قدر عمیق افکار کو اس نفاست کے ساتھ ادا کیا۔ ان کی شاعری کو عقلی اور انسانی قرار دینا ذوق سلیم کی تفسیح ہے۔

غالب کی شاعری فلسفیانہ اشعار تک ہی محدود نہیں۔ آپ نے اخلاقی عشقیہ۔ صوفیانہ نفسیاتی ہر قسم کے مضامین قلمبند کئے ہیں۔ جو عقل و شعور کے دائرہ سے خارج ہیں۔ اور انسانی فطرت کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے کبھی دل پذیر نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے بہت نا انصافی کی کہ غالب کے چند شعر پیش کر کے ظاہر کیا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا۔ اسی قسم اور اسی قماش کا لکھا مگر آپ غالب کے مشہور شعروں میں سے کچھ شعر پیش کر کے استدلال فرماتے تو ہمیں کوئی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن آپ نے شاعر کے وہی ناقص شعر پیش کئے جن سے آپ کے دعویٰ کی تصدیق ہو سکے۔

ڈاکٹر صاحب نے غالب کی داستانِ عشق و محبت کا بھی تذکرہ فرمایا ہے ہمارے نزدیک یہ قابلِ اعتراض نہیں۔ جس طرح مغربی فقاہ و با و شعرا کی زندگی کا ہر واقعہ قلمبند کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی اپنے شاعروں اور ادیبوں کی خارجی و باطنی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ لیکن جہاں تک شاعر کے کلام کا تعلق ہے۔ اس کے لب و لہجہ اور اندازِ سخن کو نہ سمجھ کر اعتراض کرنا بجا نہیں رہیئے اب ایسی جگہ چل مگر جہاں کوئی نہ ہو۔ اس نظم کو بے لطف اور غیر شاعرانہ قرار دینا حالی اور شبلی کے مدح سے نہایت تعجب و تگیز ہے۔

غالب کی معنی پرستی نے ان کے سمجھنے والوں کا حلقہ بہت محدود کر دیا ہے۔ اس سے ان کی عظمت میں فرق نہیں آتا لیکن اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر شاعری ہر مزاج اور ہر قسم کے لوگوں کے لئے ہے۔ تو غالب کا فارسی اور اردو و کلامِ عالمگیر

جاذوبیت پر ناز نہیں کر سکتا۔ اُن کی شاعری خواص کے لئے ہے۔ جمہور کے لئے نہیں۔ وہ ٹیکسیر۔ فردوسی۔ حافظ اور ہوتر کے ہمہوا نہیں۔ بلکہ براد رنگ۔ اقبال اور ٹٹی سن کے ہم نشین ہیں۔ جن کا علاءِ افرتا وسیع نہیں۔ اگر یہ لوگ جلیل الشان شاعر ہونے کے باوجود محدود حلقوں کے شاعر ہیں۔ تو غالب کے لئے علما اور شعرا کا شاعر ہونا کوئی معیوب بات نہیں۔ اس سے اُن کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

غالب کے ماحول کی خلعت فروشیاں آپ دیکھ چکے ہیں اس سے زیادہ تاریک علمی ماحول تصور میں نہیں آ سکتا۔ یہ ماحول ہی کے اثرات تھے جنہوں نے اچھے خاصے شاعروں کو قعر تنزل میں غرق کر دیا۔ انشا۔ سودا اور ذوق اس کے دامِ سخت میں ایسے گرفتار ہوئے کہ عمر بھر اسی میں پھنسے رہے۔ جس طرح لوہے کی حالی شمع سوزاں کے شعلے کو بجھا دیتی ہے۔ اسی طرح ماحول کی ناسازگاری نے ان شاعروں کی شمع سخن کو بے فروغ کر دیا۔ غالب تنہا شاعر ہے۔ جس کے راستے میں حلقہ مصداق کام نہنگ موجود تھے۔ مگر وہ اس کے دام میں اسیر نہ ہوا۔ اور ایک تابندہ گہر بن کر نکلا۔ ہم اُن کی شاعری پر یہ عرض نہیں کر سکتے۔ کہ اس میں بیشمار فنی اور سافنی نقابش ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ آپ نے مشکلات کا کس طرح مقابلہ کیا۔ اور کس حد تک کامیاب رہے یہ غالب ہی تھے جو اپنے معاصروں کی طرح لغزشوں کا شکار نہ ہوئے اور عامیانہ شاعری سے دامن بچا کر شستہ اور ہذب شاعری کی طرف جانکے۔ اس عظیم کامیابی کے سامنے جو اُن کو اس قدر شعریت سوز زبانی میں حاصل ہوئی۔ معمولی محاورات اور الفاظ کی غلطیاں کوئی عثیت نہیں رکھتیں۔ طوفانِ حوادث نے سب کشتیاں غرق کر دیں۔ مگر ایک روشنی کا ثابت قدم اور مضبوط

مینار نقاد جو اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اور دوسروں کو صحیح راستہ کی طرف آنے کی دعوت دیتا رہا۔ آخر اُس کا استقلال کام آیا اور طوفانی سمندروں کے ملاح اُسی کو منزلِ حافیت تصور کرنے لگے۔ غالب نے اپنے ماحول کے ہاتھوں شکستیں کھائیں۔ اُن کے جسم و جان کو نہایت کو فت ہوئی۔ مگر آپ نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اپنے عہد کی عام سطح سے اس قدر اونچے اُڑے کہ ہم آج تک اُن کی پرواز کو نہیں پاسکے۔ اور اُن کے فکر سخن کی رفعت کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ مرزا میں جدت کا مادہ اس قدر تھا کہ ایشیا کا کوئی غزلگو شاعر اس حیثیت سے اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلاف میں صرف میر اور غالب دو شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شخصیت کے اظہار کی کوشش کی۔ ایک متوسط قابلیت کا شاعر ہے۔ دوسرا دنیا کے ممتاز ترین شاعروں کا ہم پیشہ و ہم مشرب ہے۔ غالب نے شاعری کو جس اوج کمال تک پہنچایا۔ جدید شاعر اُس کے نصف تک بھی نہیں پہنچ سکے۔ بالخصوص غزلگوئی میں وہ غالب سے ساتھ موازنہ کر کے اپنے شاعرانہ کارناموں پر ناز نہیں کر سکتے۔ فانی اور آصف کا مرزا سے مقابلہ ہی نہیں۔ ان کے متعلق ایک جدید نقاد بیباکی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ حقیقی شاعر نہیں۔ دورِ جدید کے سب سے بڑے شاعر انبال کی انتہائی پرواز تکمیل ان اشعار تک پہنچی ہے۔

در دشتِ جنون من جبریل لبوںِ حمیدؔ یزداں بہ کند اور اے ہمتِ مردانؔ
موتیِ سمجھ کے شانِ کربھی لے جن لے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے
کبھی لے حقیقتِ منظرِ نظر آہاں مجاز میں کہ ہزاروں بجد سکو پٹے ہیں کج ترین نیاز میںؔ

گفتند جہان ما آیا بہ تو سے سازد

گفتم کہ نئے سازد۔ گفتند کہ برہم زن

ان کے مقابلے میں غالب کا کوئی بلند شعر لے لو۔ نمایاں فرق نظر

آئے گا۔

توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے
 بندگی میں بھی آنادہ و خود ہیں کہ ہم
 بزم قدح سے میث تمنا نہ رکھ کہ رنگ
 عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
 ہمہ ناامیدی - ہمہ بدگمانی
 میں دل ہوں فریب و فاقہ و رگلاں کا
 ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
 نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

خوشامدی جو پیش قدمہ و مشربِ عذیب
 پابستہ نور و خمیالی چو واری
 محترم لادۂ اطراف باطعیم
 جنت نمکند چارۂ افسردگی دل
 خمد و مکافات بہ غلہ و سفر آویخت
 قطرہ و موج و کف و گرداب چو نست لب
 مے نوش و تکیہ بر کریم کردگار کن
 خطِ پیالہ را رقم چون و چند نیست

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ غالب کی شاعری میں جو بنیادی نقص بٹائے جاتے
 ہیں وہ ان کا ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کے دیوان میں عقلی اور تخلیقی اشعار
 کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اور اگر نسخہء حمید یہ کو بھی سامنے رکھا جائے۔ تو
 مرزا کا شاعرانہ مرتبہ بہت پست ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر انصاف پسند نقاد

تسلیم کرے گا۔ کہ جب شاعر نے خود ایک غزل لکھی ہے۔ تو ہمیں کوئی حق نہیں۔ کہ اس کو مستزاد میں تبدیل کریں۔ یعنی اُن اشعار کو پھراؤں کے دیوان میں شامل کریں۔ جن کو اُس نے قلمزد کیا ہے۔ غالب کے مروجہ دیوان میں ناقص اشعار بہت ہیں۔ اُن کی تعداد اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ جتنا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اشعار ذیل یوں تو بامعنی ہیں۔ مگر ان میں کوئی عمدہ مضمون نہیں ادا کیا گیا۔ ان کا شمار مصنوعی شعروں میں ہے :-

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجے - ہم نے بدھایا
دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم اہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
غنجہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
عالم دل نہیں معلوم لیکن اس قدر مینی تم نے بارہا ڈھونڈھا ہم نے بارہا پایا
شور پندنا صبح نے زخم پر نمک چھڑکا

آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
اسی طرح غالب کے بعض شعروں میں آرائش بہت زیادہ ہے۔ مثلاً
آگئی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے بدعا عتقا ہے اپنے عالم تقریر کا
ہوں ترے وعدہ نہ کہنے میں بھی راضی کہ کبھی گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا
نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

حیاپ موجب رفتار ہے نقش قدم میرا
مگر جس طرح شکیبیر۔ بریدگی کی راستے کے مطابق اتنا زبردست شاعر ہے کہ وہ اپنے بڑے بڑے وزن دار نقالیوں کو بھی برداشت کر سکتا ہے اُسی طرح غالب بھی اس قدر متم با نشان شاعر ہے۔ کہ اُسکی عظمت کے سامنے اُس کی کمزوریاں ایک سیل تند کے مقابلے میں خس و خاشاک کی حیثیت رکھتی ہیں عقلی لحاظ سے عذراہ اُن کی شاعری میں بعض نہایت شدید نقائص ہیں جن کو مارے نقادوں نے ابھی تک محسوس نہیں کیا۔ ہم ان پر ایک علیحدہ مضمون میں روشنی ڈالیں گے۔

تخیلی اشعار نے ذوق کی شخصیت کو بالکل فنا کر دیا۔ مگر غالب کے یہاں اس
 قسم کے اشعار نہ اس قدر زیادہ ہیں۔ اور نہ اس قدر ناگوار کہ اُن کے شاعرانہ
 مرتبے کو پست کر دیں۔ سید عبداللطیف کے اعتراضات کا صحیح جواب
 یہ ہے۔ کہ آپ نے شاعر کا تمام کلام سامنے رکھ کر اپنی رائے قائم نہیں کی
 اور نہ اُس کے زمانہ و فروغ کا لحاظ کیا ہے۔ اگر تنقید کی بنیاد صرف ناقص
 اشعار پر رکھی جائے تو دنیا کا کوئی شاعر معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔
 حسرت اور طباطبائی نے غالب کے کلام میں محاورہ کی غلطیاں بتائی
 ہیں اور یاس عظیم آبادی نے اُن کے بعض اشعار کو نمل اور جض کو خلع و گلت
 کی بنا پر غیر دلپذیر قرار دیا ہے۔ بہت اچھا ہونا اگر یہ نقاد مرزا کی شاعری کے نقائص
 کے ساتھ اُس کے محاسن کا تذکرہ بھی کرتے۔ لیکن ان لوگوں کے محاسن شری
 بھی معایب کی طرح ایک خاص قسم کے ہیں۔ جن کو بجز اسی مرحوم کی لطیف
 تنقید کے مداح۔ نوح اور آدم کے زمانہ کی تنقید قرار دیں تو جیسے تعجب نہیں۔
 معمولی غلطیوں پر اعتراض تنقید علیہ کیلئے سامان رہے۔ اگر غالب کی شاعری کو میسر کے وجود و نقد
 نبول عالم حاصل کیا ہے تو ہمارے خیال میں اُن کو بہت ہی بڑا شاعر خیال کرنا چاہیے
 کیونکہ جس شاعر کے کلام میں نقائص کم ہیں۔ وہ آسانی سے شہرت حاصل
 کر سکتا ہے۔ زیادہ نقائص کے ساتھ عروج پا نا معمولی شاعروں کا کام نہیں۔
 اس میں شبہ نہیں۔ کہ غالب کے کلام میں بہت سی خامیاں اور محاورہ
 کی غلطیاں ہیں۔ لیکن بلند نظر نقادوں کو انہی میں کچھ کر تنقید عالیہ کے زیادہ
 اہم فراغ سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

یاس ایک ہمدرد نقاد نہیں۔ اس لئے اُس کے اعتراضات کا جواب
 دینا ضروری نہیں۔ پھر بھی اعتراض اعتراض ہے اور جواب کا تقاضا

کرتا ہے۔ مہملات غالب کے یہاں بہت کم ہیں۔ ایک دو شعروں کے سوا کوئی شعر ایسا نہیں۔ جو بامعنی نہ ہو۔ اردو دیوان کا پہلا شعر بالکل درست ہے۔ اس میں نفس مضمون یا طرز ادا کے لحاظ سے کوئی سقم نہیں۔ لفظی رعایتیں غالب کے اشعار میں بہت کم ہیں۔ اور ناگوار نہیں گزرتیں۔ ذرا لعین دامن اور برخور دار بستر، اچھے استعارے نہ سہی۔ لیکن اس قدر غیر خوش آئند بھی نہیں۔ دوسرے شاعروں کے صنایع و بدائع کے مقابلہ میں یہ کہیں زیادہ نظر فریب ہیں۔ ان سے شاعر کی بد مذاقی ظاہر نہیں ہوتی۔

مولوی نذیر احمد مرحوم اور ان کے موجودہ ہمہذا غالب کے فارسی ہائیم انداز نگارش اور فارسی مصادر کے استعمال پر اعتراض کرتے ہیں۔ فارسی معیار تقریباً ہر قدیم شاعر نے استعمال کئے ہیں۔ خود ذوق کے یہاں اس کی متعدد مثالیں نظر آئیں گی۔ فارسی آمیز طرز تحریر ایک طویل بحث چاہتا ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ اردو میں لطافت، رنگینی، موسیقیت اور لاویری فاہ سی ہی کے دم سے ہے۔ اگر فارسی کا عنصر نکال دیا جائے۔ تو اردو ایک خشک اور بے مزہ زبان بن جاتی ہے۔

رخصت اکے ندان جنوں نے خیر کھڑا ہے مرزہ خاں دشت پھر تلو امر اکھلا ہے
زخم دل پر کیوں مے مرہم کا استعمال ہے مشک گر ہنگامے تو کیا نوں کا بھی کال ہے
تو کہے غنچہ کہ اس لب پہ دہری غب نہیں چپ کہ منہ چھوٹا سا او بات ٹٹی خوب نہیں

نالہ حب دل سے چلا۔ سینے میں پھوڑا اٹکا

چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ فارسی الفاظ کی کمی نے ان کو نہایت خشک بنا دیا ہے۔ ان میں لطافت، رنگینی اور ترمیم نہایت ہی کم ہیں اس کے

بر خلاف یہ رائیں ولطیف اشعار ملاحظہ ہوں:-

گردش ساغر صد جلوہ رنگیں مجھ سے اُمید داری یک دیدہ جہراں مجھ سے
درش عنوان تماشاہ تغافل خوشتر ہے ندرشتہ شیرازہ ترنگاں مجھ سے
سازیک ذرہ نہیں فیض چمن بیکار سایہ لالہ بیدارغ سویدائے بہار
عردق مردہ مشرق میں سخن زندگی دہڑا سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسماں کو مسلمان کر دیا طوقان مغربے

نلا طہلے دریا ہی سے ہے گوہر کی یلانی
یہ بلند اشعار تو کیا معمولی اشعار میں بھی فارسی کی آمیزش سے ہی خصوصیتیں
پیدا ہوتی ہیں۔ فارسی الفاظ سے اردو کا وقار بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً
جراحت تحفہ الماس ایمنان۔ باغ جگریدہ مبارکباد است غنچہ ار جانِ رومند آیا
مر گیا صدیر یک جنبش لب سے غالب ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا
حیا کی شبیموں میں ڈوب کر تاروں کی بیابانی
چمن کی دلنشین و شیرازی کا منہ دھلاتی ہے

تراکیب اور متوالی اضافتیں بھی یہی وقار و متانت۔ رنگینی اور دلاویزی
پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے کسی شاعر کے فارسی آمیز طرزِ تحریر پر بہت سوچ
سمجھ کر اعتراض کرنا چاہئے۔ اگر ہم فارسی الفاظ کے استعمال کو برا جانتے ہیں تو
بہتر ہے کہ ان کو نیک قلم اردو زبان سے خارج کر دیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان
الفاظ کے بغیر زبان ڈیرھ سو سال پیچھے جا پڑے گی۔ اور اس کی قوت بیا
ہیں بہت فرق آ جائیگا۔ ہمیں صرف تغزل کے لئے زبان کی ضرورت نہیں۔
بلکہ ہر قسم کے مطالب و مافی کو ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ فارسی کے بغیر اردو
یہ اچھن منزلیں طے نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں چونکہ فارسی اردو زبان کا

جز و بدن بن چکی ہے۔ اس کی موجودگی پر اعتراض کرنا لاعاقل ہے۔ انگریزی زبان میں لاطینی مسریت کر گئی ہے۔ تو اس کو تمام ادیب بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ اگر کوئی فقرہ سارے کا سارا لاطینی ہو۔ لیکن اس کی ساخت انگریزی زبان کی نچ اور اصولوں کے مطابق ہو۔ تو وہ اس کو مستند انگریزی خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی عبارت میں تمام الفاظ فارسی کے ہیں اور ساخت اردو ہے۔ تو وہ اردو کا صحیح نمونہ خیال کی جائے گی۔ مثلاً غرہ اور چہ بناٹے عالم مکاں نہ ہوئے بُرنگ سایہ مرغ ہوا۔ نقش قدم میرا نیم نکت گل۔ اطہر و لطیف و خیر۔ شمار سجہ۔ مرغوب بہ مشکل پسند آیا۔ کہ انداز بہ خوں فلطین دل بسمل پسند آیا۔ ان مصرعوں پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ صحیح اردو نہیں۔ یا یہ کہ مثنوی شود اور آند کی کمی ہے۔ ورنہ یہ تمام مصرعے فارسی بن جائیں۔ چونکہ ان کی ساخت اردو ہے۔ اس لئے یہ مستند اردو ہیں۔ البتہ فارسی الفاظ کی بلا وجہ بھرمار پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کے برعکس کیا عام بول چال کے الفاظ کا زیادہ استعمال بھی ہو نہیں سکتا؟ اور بوجھے ہوں سمجھیا نہ کے سارے زن دمرد کیا اس میں ٹھیک اردو الفاظ کی بھرمار نہیں؟ الفاظ پر بحث آرائی بے سود ہے جس طرح کوئی شاعر الفاظ کو استعمال کرتا ہے۔ کرے۔ اس پر فارسی اور غیر فارسی۔ اردو اور غیر اردو کی پابندیاں عاید کرنا درست نہیں۔ ہر شاعر کی ایک خاص ذہنیت ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے مطابق شعر کہتا ہے۔ ہمیں اس کے اشعار کا مطالعہ اس کی طبیعت کی روشنی میں کرنا چاہیئے۔ اپنی طرف سے اصول وضع کر کے تنقید نا شناس سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ زیادہ آرائش کے ہم بھی مداح نہیں۔ زبان صاف اور شستہ ہو تو فارسی الفاظ کے بغیر بھی

لطف دے جاتی ہے۔ لیکن شعرا کو مختلف ضروریات کے لئے مختلف قسم کا شعرو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ہم اُن پر کوئی پابندی عاید نہیں کر سکتے۔ غالب کے بعض اشعار میں ضرورت سے زیادہ صناعی دکھائی گئی ہے۔ مگر مستحیات پر تنقید کی بنیاد کون رکھے؟ مرزا کا انداز پر عظمت ہے۔ اور اُس کے لئے فارسی الفاظ کا استعمال ضروری ہے۔ اس سے آپ کے قاریٹن کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ مگر عظمت پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔

ایک غیر معروف نقاد نے غالب کے بعض اشعار میں ابتذال ثابت کیا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا حافظ اور سعدی جیسی جلیل القدر ہستیاں بھی شکار ہوئی ہیں۔ غالب کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ اُن کے مبتذل اشعار کی زبان بھی ہمیشہ شستہ اور بیان لطیف ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دیگر شاعروں کے مبتذل رشحات کی مانند ناگوار نہیں لگتے۔ ہم سے کھل جاؤ، بہ وقت ہے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر عذر رستی ایک دن
دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب بیش رستی ایک دن
کافی ہے نشانی ترا چھلے کا نہ دینا خالی مجھے دکھلا سکے بہ وقت سفر انگشت
دھول دھپا، اور انگشت دکھانا کیسے ممکن ہیں لیکن اس قدر ناگوار
نہیں کہ نظیر اکبر آبادی۔ میر تقی میر۔ دوشادہ و دوستان کے اشعار کی مانند
نفرت انگیز ہوں۔ بعض اشعار میں ذم کا پہلو نکلتا ہے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریاغادہ رند شاید باز
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
بساط عجز میں تھا ایک دل کی نظر خوں بھی
سوہتا ہے ہانڈا چکیدن سرنگوں بھی
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا حال ہے میرا سر آگے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک ساجواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کیوہ طور کی

لفظ 'شاہد یار' ذوق نے بھی استعمال کیا ہے۔ باقی شعروں میں ذم ہے لیکن
چونکہ ذم ہمیشہ بے احتیاطی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور مہرین کی اپنی رسوائی گاہی سے
معروض اظہار میں آتا ہے۔ ہم اس کو شاعر کی فنی کوتاہی نہیں قرار دے سکتے۔
زیادہ سے زیادہ اس کو ناگوار فحش یا فروگزاشت کہا جاسکتا ہے۔ اقبال۔
انیس اور داغ سب کے کلام میں متعدد اشعار ایسے ہیں جن سے ذم کا پہلو
نکلتا ہے۔ جرم اتنا عام ہے کہ اس کو قابل سزا نہیں قرار دیا جاسکتا۔

بعض نقاد غالب کے اخلاق اور افعال و کردار پر بھی حملہ کرتے ہیں سب
سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اُس نے مادی اغراض کے لئے قصیدے لکھے۔
یہ اعتراض بہت معقول ہے۔ اور اس کا فیصلہ واقعات کی تحقیق پر
موقوف ہے۔

ذوق کے مذاحوں کو غالب کی مقبولیت کا راز شریوں کی کثرت میں
نظر آتا ہے۔ ہم اس خیال میں اُن سے اتفاق نہیں رکھتے۔ کیا یہ نسخہ ذوق
کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا؟

اُن معمولی باتوں کے جو ہم زیادہ دلچسپ مباحث کی طرف آتے ہیں۔
نقدیہ عالمیہ کا مرتبہ بڑا فرض نہ شاعری کے محاسن کی توضیح ہے۔ اور نہ
اشعار کی تشریح۔ فنی خصوصیات اور شخصیت کا مطالعہ ہر بلند نظر نقاد
کے لئے ضروری ہے۔ فنی خصوصیات اس مضمون کے محدود میدان میں
سمجھ نہیں سکتیں۔ اس لئے ہم صرف غالب کی شخصیت کو لیتے ہیں
اور دیکھتے ہیں کہ اُن کے خیالات احساسات۔ مزاج اور اخلاق کا

رنگ جو ہنگ کیا ہے۔ یہ موضوع بھی ایک ایسا عنوان ہے۔ جو ایک علیحدہ افسانہ کا تقاضا کر رہا ہے۔ اس تصنیف کے صفحات میں ان تمام باتوں کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس لئے ہم غالب کی شخصیت کے ایک دو پہلوؤں پر سرسری نظر ڈال کر رشتہ معنی کو کوتاہ کرتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ ان کی شخصیت کتنی شاندار تھی۔ اگر مرزا کو ایک شاعر نہ تسلیم کیا جائے۔ پھر بھی ان کی شخصیت اتنی عظیم الشان ہے۔ کہ وہ دنیا کی بزرگ ترین ہستیاں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں +

غالب کو عام طور پر ایک فلسفی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک فلسفی سے بھی زیادہ وہ ایک مجسمے انسان ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کی بشریت ان کے فلسفے سے زیادہ وقیع ہے۔ دنیا میں ہزاروں فلسفی پیدا ہوئے ہیں۔ اور ان کی قدروں پر بھی ہوتی ہے۔ مگر بنی نوع انسان کے سب سے بڑے محسن وہی ہیں جو ایک ہمدرد دل، نازک طبیعت اور حساس غمیرے کو پیدا ہوئے۔ گو تم بدھ شاکی تھے۔ شیخ ابن مریم۔ محمد۔ اشوک۔ ملاطین تو تھروہ، برگزیدہ ہستیاں ہیں۔ جن کے دل میں ہمدردی اور اخوت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے نئے فلسفے اور عقیدے رائج کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ انسانوں کو بہتر بنانے کی کوشش فرمائی۔ فلسفہ بجائے خود کوئی بڑی چیز نہیں۔ دیگر علوم کی مانند یہ بھی ہماری ضروریات میں سے ہے۔ لیکن فلسفی عموماً خشک مزاج۔ بے حس اور سخت دہن ہوتے ہیں۔ فلسفہ ان کی بشریت کو فنا کر دیتا ہے۔ بہت کم انسان ہیں جو نیک۔ خاص۔ فلسفہ یا خاص عقاید کو مان کر رواداری۔ بے تعصبی اور آزادانہ

سے کام لیں۔ کورسج اور اقبال کو ایسے عقاید کی مضبوطی نے ان کی بشریت کو فنا کر دیا ہے۔ وہ زیادہ تر مسائل کی طرف جاتے ہیں۔ اور زندگی کے عام واقعات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ فلسفہ نے اقبال کی بشریت کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔ اختر شیرانی کہہ سکتا ہے کہ

سنو یہ کیسی آواز آرہی ہے کوئی گاؤں کی لڑکی گارہی ہے
جلی ہے شاید اٹا پیسنے کو کہ چکی کی صدا بھی آرہی ہے
تھکن سے جو اپنے ننھے دل کو ترانہ چھیڑ کر بہلا رہی ہے

”مجھے لینے نہ آئے اچھے آبا جہاں سے چاہ اٹھتی جارہی ہے
یہ برکھارت بھی بیٹی جارہی ہے
نہ لی بھینا نے بھی سدھ بدھ ہماری جہاں سے چاہ اٹھتی جارہی ہے
یہ برکھارت بھی بیٹی جارہی ہے
گیا پیلیں بڑھانے کا زمانہ وہ امریوں پہ کوئل گاری ہے
یہ برکھارت بھی بیٹی جارہی ہے
ٹھٹھا کی اودی اودی چڑیوں سے مری سکھیوں کی بو باس آرہی ہے
یہ برکھارت بھی بیٹی جارہی ہے“

اور حفیظ کہہ سکتا ہے کہ

ہاتھوں میں دٹے ہاتھ رقصاں ہوئے برجنا تھ
مگر اقبال عام زندگی اور بشریت سے اس قدر دور ہے کہ وہ انسانوں
و انسانوں کی حیثیت سے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے تمام انسان یا
مسلمان ہیں یا کافر۔ مرزا غالب ایک جید فلسفی تھے بہت ممکن تھا کہ وہ

دیگر فلسفیوں کی مانند سگدل - خشک مزاج اور تنگ نظر ہو جاتے۔ یا اپنے خیالات کی دنیا میں اس قدر محو ہو جاتے کہ اُن کو دنیا و مافیہا کی خبر نہ ہوتی۔ لیکن غالب کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ جہاں وہ ایک عظیم الشان فلسفی تھے۔ وہاں ایک عظیم الشان انسان بھی تھے۔ اُن کی شاعری کو صرف اُن کے فلسفہ ہی نے مشہور نہیں کیا۔ بہت سے ناظر ہیں جو اُن کے فلسفیانہ اشعار سے وحشت کرتے ہیں۔ غالب کی بشریت نے تمام انسانوں کے دل کو موہ لیا ہے۔ اُن کی اردو اور فارسی شاعری ایک درد مند دل کی غمگین راگنی ہے۔ ایسی راگنی جس کو سن کر پتھر کا دل بھی موم ہو جائے۔

غالب کے لئے تصوف ایک اور گمراہ کن راہبر تھا۔ یہ بھی انسان کی توجہ کو عام دنیاوی زندگی اور عام انسانوں سے ہٹا کر ایک موہوم ہستی اور موہوم تصورات کی طرف لے جاتا ہے۔ مرزا غالب فلسفہ اور تصوف دونوں کے گمراہ کن اثر سے آزاد ہے۔ بلکہ اُن کی بشریت نے ان دونوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ اُن کا فلسفہ اس لئے زیادہ دلفریب بن گیا ہے کہ اس پر اُن کی بشریت نے اپنا پر تو ڈالا۔ مرزا غالب تخیلات اور فنا و بقا کی موہوم لذتوں کی طرف جاتے ہیں۔ لیکن دنیا کی محبت اُن کے دامن دل کو نہیں چھوڑتی۔ اُن کو ایک طرف آسمان کھینچتا ہے۔ دوسری طرف یہ خالہ بن سفل۔ وہ دنیا کو موہوم خیال کرتے ہیں مگر اس کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے فرمایا ہے کہ

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کب مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے پھر فرماتے ہیں کہ

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجڑائے ایمان ہم گئیں
ماں مرزا غالب موحد ہیں۔ اور ایک فرقہ تصوف ہستی میں ایمان رکھتے ہیں۔ جو

سرحد ادراک سے پرے ہے۔ مگر وہ صرف اسی سے لو لگا کر نہیں بیٹھ رہتے۔ آپ ووڈ سورتھ اور دیگر صوفیوں کی مانند ایک موبہوم دنیا میں آباد نہیں ہونا چاہتے۔ بلکہ اس دنیا میں جمال حق کو جلوہ پیرا دیکھ کر اسی میں زندگی بسر کرنے کے مستعد ہیں۔ اس لئے فرمایا ہے کہ

اصل ٹھوڈ شاہد مشہود ایک ہے جہاں ہوں پھر شاہد ہے کس حساب میں
نہ ہو بہ ہرزہ بیا باں نور و ہم وجود ہنوز ترے تصور میں ہی نشیب و فراز
یعنی تو سمجھتا ہے کہ حسن ازل اپنی شانِ جمالی و جلالی کے ساتھ ایک علیحدہ گوشہ میں منردی ہے۔ حقیقت میں وہ تمام کائناتِ فطرت میں جلوہ پیرا ہے۔ اس کا جلوہ کہیں عام اور کہیں خاص نہیں۔ وہ یکساں طور پر تمام موجودات میں طاری و ساری ہے۔ نشیب و فراز ہمارے تصور کی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب صرف شاہد ازل ہی کو دیکھنے کے متناقی نہیں۔ بلکہ شاہدانِ ارضی سے پیمان وفا باندھنے کو بھی مایہ حیات تصور کرتے ہیں۔

نہیں مگر سرور برگ ادراک معنی تماشائے نیرنگ صورتِ سلامت
گر بہ معنی نرسی جلوہ صورت چہ کم است خلقِ لطفِ سرطوب کلا ہے دریاب
عالم آئینہ عزازست چہ پیدا چہ نہاں تاپ اندیشہ نداری بہ نگاہ ہے دریاب
مرزا غالب دنیا کو اس لحاظ سے موبہوم خیال نہیں کرتے کہ یہ بے اصل و بے حقیقت سراپ ہے۔ بخنوری مرحوم نے غالب کو درست طور پر نہ سمجھا اور ان کے فلسفہ کو اہمیت صوں کا فلسفہ قرار دیا۔ ایک غیر معروف نقاد نے آپ کی اس رائے کی تردید کر کے ظاہر کیا ہے کہ مرزا کے نزدیک کائنات بالذات موجود نہیں۔ اس کا وجود داخلی ہے۔ اس لئے آپ فرماتے ہیں کہ

خطے بستی عالم کشیدیم از مرثہ بستن ز خود رفتیم و ہم با خویشین بزم دنیا دا

درحقیقت یہ غالب کا فلسفہ نقیض ہے۔ وہ اس کی بنا پر دنیا کو موبوم نہیں خیال کرتے۔ اُن کی رائے میں یہ دنیا سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس کا وجود داخلی ہے۔ اور یہ اپنے خالق کے ذہن میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا اس کو لیزا کی سیما قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ

باوجودیکہ جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ہیں چراغانِ شبستانِ دل پروانہ ہم
مخلین کہ ہم کرے ہے گنجہ بازِ خیال ہیں ورقِ گردانیِ بیرنگ یک بتخانہ ہم
یہ خیال عام انسانوں کا خیال نہیں۔ بلکہ ہستی مطلق کا خیال ہے۔ اسی مضمون کو مرزا غالب نے ایک فارسی تنزیی میں بالتفصیل بیان فرمایا ہے۔ شاعر کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے اس مثنوی کا مطالعہ ضروری ہے +

غالب کی دنیا سے محبت خیالات تک ہی محدود نہیں۔ وہ ایک فلسفی اور بلند نظر صوفی ہیں۔ مگر حقیقت کے سایہ کے لئے مجاز کی نظر فریب دہنی کو نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ جہنموں کے غمزہ و عشوہ و ادا کے دلدادہ ہیں۔ اور عشق و محبت میں عام انسانوں کی مانند لچھی لیتے ہیں۔ اسی لئے بجنوری مرحوم نے کہا ہے کہ

مرزا غالب کی معشوقہ مریم نہیں۔ جو خیال سے پاک اور جنس مقابل سے بالا ہے۔ بلکہ زلیخا ہے۔ وہ خود دیوسف نہیں بلکہ سری کرشن ہیں۔ اُن کے معشوق کی تصویر رافائل (Raphael) نہیں کھینچ سکتا۔ یہ روبنس (Rubens) کا کام ہے؟

یہی وجہ ہے کہ غالب روحانی عشق کے نقموں کے ساتھ مجازی عشق کی راگنی بھی گاتے ہیں۔

در گرد ناله وادی دل ز مگاہ کیست خونے کے لئے دود بہ شرامیں سپاہ کیست؟
 صبر تو در حجاب ز شرم نگاہ کیست جابر کر شمر تنگ ز جوش نگاہ کیست؟
 مہا تو آشنا و تو بیگنا نہ ز ما آخر تو و خدا کہ جہانے گواہ کیست؟
 غالب حساب زندگی از سر گرفته است جانان بہ من بگو کہ غمت عمر کا و کیست؟
 مرزا غالب اپنے اس شیوہ عاشقانہ اور شعار رندانہ کی وجہ بھی بہت
 معقول بتائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

تما شائے گلشن تنہائے چین بہار آفرینا بہنگار ہیں ہم
 انسان کی معصیت کوشی اور اس کا احساس غالب کی طبیعت میں ایک فی الحال
 ضمیر بن کر جاگزیں ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے کوئی ایشیائی شاعر غالب کا مقابلہ
 نہیں کر سکتا۔ وہ مجسم ندامت اور افعال ہیں۔ اس لئے سب سے افضل
 اور سب سے زیادہ حساس ہیں۔ آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دریائے معاصی تنگ آبی سے ہوا خشک میرا سرد اس بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
 پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا بخوں غلطیہ صدرنگ عوی پارسائی کا
 رحمت اگر قبول کرے کیا بعبہ ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
 آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے مر گناہ کا صاحب خدا نامک

غالب نے ایک حقیقی انسان کی مانند زندگی بسر کی۔ اور زندگی کے تمام
 معاملات میں حصہ لیا۔ سید عہد الطیف نے یہاں بھی نا تو اس مینی کی ہے۔ اور
 کہا ہے کہ مرزا کی زندگی میں کوئی معین مقصد یا دستور العمل نظر نہیں آتا۔ گویا
 اس زمانہ میں یہ دونوں باتیں ممکن تھیں۔ باقاعدہ زندگی بسر کرنا تو موجودہ زمانہ میں بھی
 مشکل ہے۔ معلوم نہیں سید صاحب کس قسم کی زندگی کے متلاشی ہیں دیکھنے
 کے قابل بات یہ ہے۔ کہ غالب کی باطنی زندگی کس قسم کی تھی اس کو ادب نگاہ

سے دیکھا جائے تو ہمیں مرزا غالب کی زندگی میں تمام وہ باتیں نظر آتی ہیں۔ جو بلند ترین انسانوں سے مخصوص ہیں۔ انہوں نے ایک حقیقی شاعر کی مانند دنیا کی ہر بات میں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ اپنے حقوق کے لئے قانونی چارہ جوئی بھی کی۔ اگر ٹیکسیر کے لئے یہ بات مایہ ناز خیال کی جاتی ہے۔ کہ وہ ایک اعلیٰ فاکر ہونے کے ساتھ دنیاوی معاملات میں بھی نہایت ہوشیار اور زیرک تھا۔ تو غالب بھی سچا طور پر اپنی فلسفیت اور فرائی پر ناز کر سکتے ہیں۔

غالب کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے۔ آپ نے زندگی کے واقعات کا بہترین فائدہ اٹھایا۔ اور خود تجربہ حاصل کرنے کے لئے دام ملائق میں اُٹھے۔ آپ کی مے نوشی۔ قمار بازی اور دیگر لغزشیں کسی پر مخفی نہیں۔ آپ نے ان کا اپنی شاعری میں خود اظہار کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ سہ میر غم خانے کی قسمت جب تم ہوئی لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

مرزا غالب نے دانستہ یہ ویرانیاں اور پریشانیاں مول لیں۔ وہ اپنی نادانیوں کی وجہ سے مصائب اور رنج و محن میں مبتلا تھے اور قحط کے طور پر دنیا کو ایسی مفید تعلیمات دیں۔ کہ نوزع بشر ان کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ذیل کے اشعار غالب کے تجربہ زندگی کا پتہ دیتے ہیں۔

جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
صید دام جستہ ہے اس دام گاہ کا
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں ہا
متاع بردہ کو سمجھے ہو میں قرض ہزن پر
دیکھیں گا گزرے ہو قطرے پہ گہر ہونے تک

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
بزم قلع سے عیش تنہا رکھ کر تنگ
جاتا ہوں دلخ حسرت ہستی لئے ہوئے
فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا
دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام ہنگ

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
غازگر ناموس نہ ہو گر ہو س زر
ہزاروں محبتیں ایسی کچھ ہریش پدم نکلے
لے تازہ واردان بباط ہو آئے دھیر
ساتی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
حنائے پائے خزاں بہار اگر ہے یہی
نہ سنو گر برا کہے کوئی
روک نہ کر غلط چلے کوئی
کون ہے جو نہیں حاجت مند
جام جم سے تیرا جام سفالی اچھا ہے
کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں دے
بہت نکلے مرا رمان لیکن پھر بھی تم نکلے
زہار گر تمہیں ہو س نائے ونوش ہے
مطرب بہ نغمہ ہرن ٹمکین ہو ش ہے
درام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا
نہ کہو گر برا کرے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
کس کی حاجت روا کرے کوئی؟

مندگی کے تلخ تجارب غالب کی طبیعت میں غم بن کر سرایت کر گئے۔
یہ رنج و غم کا احساس اُن کی شخصیت کا سب سے دلکش اور انگیز پہلو ہے۔
میر اور اکبر اپنی جلی یاس پرستی کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کا غم زندگی کی تنہوں
اور ناکامیوں کا نتیجہ ہے۔ اُن کو فطرت نے حزن پرست بنا دیا ہے۔ غالب غموں
کا شکار ہوئے۔ انہوں نے رنج و غم کے شعر کہے۔ مگر اس طرح کہ اُن سے
ذاتی ناکامیوں کے ماتم کی صدا نہیں آتی۔ وہ ایک درد مند دل کی فریاد ہیں۔
طوفان حوادث نے مرزا کو دنیا کا عمیق مطالعہ کرنے پر مایل کیا اور ذاتی
فکرتوں اور ہزیمتوں پر رونے دھونے کی بجائے زندگی کے حزن و غم فلسفہ
کی طرف رہنمائی کی۔ ان کی اشعار میں غالب نے خود کا غدی پیر بننا
ہوا ہے۔ وہ نالہ کو اس طرح پابند نے کرتے ہیں۔

مصحف ہو گئے قوی غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں
جاتا ہوں داغِ حشر ہستی لے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخوردِ محفل نہیں رہا

عمومی میں نیاں غم گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
 چرباغ مرصعوں میں یزباں گویا ہوا کا
 کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو راب
 دیکھا تو کم ہوئے چہ غم روزگار تھا
 اوراق زمانہ درنوشتیم و گزشت
 درفن سخن یگانہ گشتیم و گزشت
 مے بود دوائے ماہہ پیسہ سی فالتب
 زان نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

ہازی خور روزگار بودم ہمہ عمر
 از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
 بے مایہ فکر سود ماندم ہمہ عمر
 بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

نے کشتہ زخم و نادک و شمشیرم
 لب مے گزم و غوں یزباں مے لیس
 نے خستہ ناخن پلنگ و شیرم
 فوں مے خورم و ز زندگانی سیرم

در باغ مراد ما ز بیداد و نگرگ
 چوں خانہ خراب است چہ نالم از سیل
 نے نخل بجائے ماندنے شاخ دبرگ
 چوں زیت و بال ست چہ ز بیم ز مرگ

لے تیرو زمین کہ بودہ بستر من
 ز بہر کساں و بہر من دانہ دوام
 ہر خاک کہ باتت ہمہ بر سر من
 لے مادہ دیگران و مادہ ندر من

شدت یاس

ہو چکیں فالتب بلا میں سب تمام
 نیست وقتے کہ ماہ ہٹے از غم نرسد
 ایک مرگ ناگہانی اور ہے
 دیکھیں کیا گزشتے ہے قطرے پہ گہر ہونگ
 دامن ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
 زان نے ترسم کہ گرد و قود و رخ جائے من
 زبیت سوختن ماہ بہنم نرسد
 دلتے گراں شد ہمیں امرو من فردائے من

یہ خزانہ رنگ طبیعت اُن کو زندگی کے تاریک پہلو کی طرف لے گیا۔ اُن کو خدا کے رحیم و شفیع ہونے میں بھی شبہ گزرنے لگا۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غائب ہم بھی کیا یاد رکھیں گے کہ خدا رکھتے تھے وہ ہستی کو ایک ہیبتناک اصلیت خیال کرتے ہیں۔

قید ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
کشا کشا کشا ہستی سے کرے کیا سعی آزادی ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت وانی کی
یہ وہی قدیم ہندی فلسفہ ہے جو تمام اشیائے قدرت کو زندگی کی زنجیر میں
مقید قرار دیتا ہے۔ اور تاسخ کے مسئلہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسی لئے غالب فرماتے ہیں کہ

سب کہاں کچھ لالہ دگل میں غایاں ہو گئیں خاک میں کیا صدوقین ہو گئی کہ پہناں ہو گئیں
وہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی ایک فریب سلس اور حادثوں کی دامگاہ ہے
زندگی اور غم آپس میں غیر منفک طور پر مربوط ہیں
قید حیات و بند غم اس میں نوز ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غالب اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ قدرت میں رحم نہیں۔ یہ ایک سفاک اور ظالم ہستی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ہے زخم آفریں آرایش بیدادیاں اشک چشم دام ہے ہر آنہ صیادیاں
ہے گداز موم انداز چک رہائے خوں نیش زبور عسل ہے نشتر فصا دیاں
قطرہ ہائے خون بسلیب ناں ہیں اسد ہے تماشا کردنی گلچینی جلادیاں
آرایش زمانہ ز بیداد کردہ اند ہر خوں کہ ز تخت غارہ روئے زمین شناس
لے بیزہ سرورہ از جو رہا چہ نالی درمیش روزگار ماں گل خونہا ندارد
کارخانہ امید خاکبازی طفلی یاس کو دو عالم سے لب بخندہ داپایا

سب سے عمدہ شعروہ ہے۔ جس سے اردو دیوان کا افتتاح ہوا ہے۔

نقل فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
اس شعر کے معنی وہ نہیں۔ جواب تک ہمارے نقاد اس میں زبردستی
ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ناکام رہ کر کہتے ہیں۔ کہ شعرا قص یا ہزل ہے
یہ شعر مولانا نے روم کی نظم بشنوانے چوں حکایت مے کند۔ یعنی ممکنات
کی واجب الوجود سے جدائی کا مضمون ادا نہیں کرتا۔ اس کا تصوف یا
مبداء فریش سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق قدرت کے ساتھ ہے۔
ہمارے یہاں قدرت اور خدا کی طرف ایک ہی انداز میں اشارہ کیا جاتا
ہے۔ اس لئے قارئین کو شعر کے سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ مرزا غالب
ٹٹی سن کے ہمزہاں ہو کر فرماتے ہیں۔ کہ قدرت کے ہاتھ اور کام و دہن فوخی
سے سرخ ہیں۔ قدرت ایک عالم اور ظاہر ہستی ہے۔ اور تمام مخلوقات پر ستم
ڈالتی ہے۔ ظلم کا مفہوم غالب نے شوخی تحریر کی شوخی ترکیب سے ظاہر کیا ہے۔
اگر وہ زشتی تحریر استعمال کرتے۔ تو شعر کی ساری لطافت زایل ہو جاتی۔ اور
اس میں شوخی نہ پیدا ہو سکتی۔ شعر اور ادب کے سلمہ اسالیب بیان میں
سے ہے۔ اس لئے شاعر نے اس کے استعنائ میں تامل نہ کیا۔ چونکہ غالب
کے زمانہ میں واوین معکوس اور تعلیق کا رواج نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے
کم ذوق اور نا فہم قارئین پر اپنا انی الضمیر اچھی طرح ظاہر نہ کر سکے۔ اگر
وہ شوخی تحریر کی جلی حروف میں بھی لکھ دیتے۔ تو ان کا مطلب فوراً

واضح ہو جاتا۔ لیکن چونکہ غالب کے زمانہ میں ان کا رواج نہ تھا۔ اس لئے وہ شوخی تحریر کو معمولی طور سے لکھنے پر مجبور رہے۔ شعر کے معنی صاف ہیں۔ یعنی ممکنات اپنی مبربادی اور فناء کو یکہ کر دینے مفہوم شوخی تحریر سے نکلتا ہے، قدرت کی ستم کو شی کے خلاف فریاد کرتی ہیں۔ مرزا غالب کے اپنے بتائے ہوئے معنی ہماری تشریح کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کی عبارت سے صوفیادہ معنی نہیں نکلتے۔

غالب کو اس فلسفہ کے ادراک پر داد دینی چاہیے۔ شوخی نگار کی نظر اس فلسفہ تک سائنس کے تمام جدید ترین معلومات کو سامنے رکھ کر پہنچی۔ لیکن ہندی شاعر نے اس کا اپنے پُر شوکت تخیل کی مدد سے ادراک کیا۔ مرزا غالب اس لحاظ سے زمانہ معجزہ کے گوتم بدھ ہیں۔

مرزا نے اس فلسفہ کا ادراک کیا۔ مگر اس میں محصور نہ ہوئے۔ وہ اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر آگے نکل گئے۔ ان کی ترقی پسند طبیعت کسی خاص نقطہ پر ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ بقول بجنوری وہ اس ظلمات سے باہر نکل آئے اور سلوک کے مراحل طے کرنے کے بعد کامل بصیرت پیدا کی۔ ان کو بچہ و غم اور مصیبتوں کی شکایت بھول گئی۔ تسلیم و رضائے ان کی طبیعت کو وہ سکون بخشا جو ہر متعین طبیعت کی سرگرمی عمل کی انتہا ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

غالب کی بشریت ان اشعار اور نظموں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جن میں وہ اپنے احباب اور عزیزوں کی جانی پرانے افسوس بہاتے ہیں۔ یا ان کے متعلق حافظ کے انداز میں کوئی اشارہ کرتے ہیں۔

مجھ سے غالب یہ علاتی نے غزل لکھوائی
 ایک بیدار گریخ فزا اور سہی
 باسراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیت
 در نہ غالب نیت اہنگب طر نخوانی مرا
 دی مرے بھائی کو حق نے از سر فردنگی
 میرزا یوسف میں غالب یوسف ثانی نگے
 شرط مست کر دئے دل خواشم ہم عمر
 خونا بہ رخ ز دیدہ پاشتم ہمہ عمر
 کافر باشم اگر کہ مرگب مومن
 چوں کعبہ سیہ پوش تباشم ہمہ عمر
 عارفت کا دردناک مرثیہ . شہزاد کی موت پر رقت انگیز ترکیب بندہ
 اور محبوب کی مرگ ناگہانی پر اظہار غم . ان کو ایک نہایت رقیق القلب
 انسان ثابت کرتے ہیں۔ پھر وہ تین شعروں کی مختصر نظم سمیٹے اب ایسی
 جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو، ہر انسان کی دلی خواہش ظاہر کرتی ہے۔ اقبال
 کی نظم دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب کی طرح یہ بھی ایک مختصر آرزو
 ہے۔

آرٹ اور مذہب دونوں نوع انسان کی اصلاح و ہدایت کے ذریعے ہیں۔
 آرٹ اپنا افرح و لطافت سے پیدا کرتا ہے۔ مذہب انفعالات کو بیدار
 کر کے قلوب انسانی میں عمل کی روح پھونکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر
 تقریر سے کام لیتے ہیں۔ اور شاعر لطیف پیرایہ میں جذبات و احساسات کا
 اظہار کرتے ہیں۔ پیغمبر اپنا مقصد فوراً حاصل کر لیتا ہے۔ شاعر آہستہ
 آہستہ دلوں میں بس کر نوع انسان کو بہتر مقام پر لے جاتا ہے۔

اسے مرغوب ہے چپکے ہی چپکے دل میں گھرنا

اُسے چشم زدن میں برق کی صورت اثر کرنا

مذہب کو مسرعت اثر کے لئے انتہائی بلندی سے نیچے اترنا
 پڑتا ہے۔ وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے ایسے ذرائع اختیار

کہتا ہے۔ جن کی لطافت میں کثافت کی آمیزش ہوتی ہے۔ اور جو بعد میں منہج روایات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تمام مذاہب کے پیروہنے آپ کو ایک خاص جماعت کے رکن خیال کر کے اخوت اور انسانیت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مذہب ہمیشہ تنگ نظری اور تعصب کو فروغ دیتا ہے۔ بلند نظر شاعر فرخاندی کا اثر مٹانے کے لئے وسیع المشروطی۔ محبت اور اخوت کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہندوستان میں مذہبی تنزل کے باعث ایک مدت سے تعصب کی گرم بازاری ہے۔ غالب کے زمانے میں تعصب نے اس قدر زور نہیں پکڑا تھا۔ لیکن عہد حاضر میں یہ ایک عالمگیر و ماہن کر ملک کے طول و عرض پر چھا گیا ہے۔ اس وقت ہمیں ایسے شاعروں اور ادیبوں کی ضرورت ہے۔ جو تعصب کی بجگنی کر کے ارض و انس میں ایک خوشگوار فضا پیدا کریں۔ غالب نے اس وسیع المشروطی کی تعلیم کا اُس وقت اور اک کیا۔ جب تعصب کا زہر کام و دہن کی آزمائش کر رہا تھا۔ اور رگ و پے میں نہیں اترا تھا فرماتے ہیں کہ۔

فاداری بشرط استغاری اصل ایماں ہے مرے بتانہ میں تو کعب میں گاڑو برہمن کو
ہیں کچھ سہ و زنا کے چندے میں گیرائی فاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

جنگ و جدل بہ جائے ماں میکدہ جوئے کا ندراں
کس نفس از جمل نژد - کس سخن از مذک خواست

خوشا رندی و جوئی ژندہ رود و شراب و لب

و لب خشکی چہ میری در سربستان مذہبہا

غالب نے تنگ نظری۔ زہد اور تعصب کے خلاف ایک خاموش مگر درست احتجاج کیا۔ اگر ہم آج اُن کی تعصب شکن اور زہد شکن تعلیم پر عمل کریں۔ تو بھنڈوسی مرحوم کا یہ دعویٰ لفظاً و معنیاً درست ثابت ہو گا۔ کہ ہندویب۔

تعمد - تعلیم - تربیت - فطرت - کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دنیوں کا اثر نہ پڑا ہو۔ سگنے کا کلام قومی اور ملکی ترقی کا باعث ہو چکا اور اپنا خاص منشا عہد پورا کر چکا۔ غالب کا کلام اب مقبول ہوا ہے۔ اور آئندہ نسلیں اس امر کا موازنہ کریں گی کہ اُن کی ترقی میں غالب کے کلام کا جزو اعظم کہاں تک مدد اور معاون ہوا ہے؟

غالب کی وارستہ مزاجی - فراخوصلگی - اور بلند نظری - ایک ایسا موضوع ہے کہ اگر دل کھول کر دریا کو بھی ساحل باندھا جائے۔ پھر بھی تشنگی ذوق کا مضمون بوجہ احسن ادا نہیں ہو سکتا۔

مرزا غالب ہمارے اخلاق کے بہترین معلم ہیں۔ ہم یہاں اُن کے اخلاقی اشعار پر نقد و نظر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اُن کی شخصیت کی یہ اور دیگر خصوصیات بہت طویل کلام چاہتی ہیں۔ دیرالملک کے مباحث اس مختصر مضمون میں نہیں سما سکتے۔ اقبال کا فلسفہ زندگی طرز بیان اختیار کیا جائے۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرزا غالب شخصیت کے لحاظ سے ایک نہایت عظیم انسان ہستی ہیں۔ مشرق میں اُن سے زیادہ شاندار فلسفی اور صاحبِ تخیل شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ حافظ شیراز کو بجا حد پر ان کا حریف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور وہ ایک معمولی حریف نہیں۔ غالب میں اُس بہت زیادہ قوتیں ہیں۔ اور اُن کی شاعری بہت سی خوبیوں کی حامل ہے۔ پھر بھی حافظ کی

نے دیرالملک میں مرزا غالب کی شخصیت اور کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔
 زہرون درگذشتم - زہرون خانہ گفتم
 سخن نگفتہ را چہ فلسفہ را نہ گفتم

شخصیت اور کلام میں کچھ ایسی رعب انگیز عظمت ہے کہ نقادوں کا خامرہ گستاخ اُن کے سامنے فی الفور سرنگوں ہو جاتا ہے۔ غالب کی شاعری نقادوں کے قلم کو عقد لہساں بنانے میں کامیاب رہتی ہے۔ مگر بلس شیراز پھر بھی ایک بلس ہے۔ اور غالب ایک آتش نفس مغنی۔ ان دونوں با کمال شاعروں کے سکوت انگیز وقار کے خلاف ذوق کے کلام اور شخصیت کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک خوابیدہ قلم کو بھی اس قدر بیدار کر دیتے ہیں کہ وہ ان پر جاویدا و بیجا اعتراض کرنے لگ جاتا ہے۔ ذوق ہرچیت سے اس قدر ادنیٰ اور ناقابل التفات شاعر ہیں کہ وہ اپنے مداحوں کی بہترین کوششوں کے باوجود غالب کے مقابلہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

۱۷ مولف حیات ذوق کا فیصلہ نہایت دانشمندانہ اور منصفانہ ہے آپ فرماتے ہیں کہ اگر نظر انصاف سے تعصب مذہبی اور رعایت تعلقداری اور قرابت کو ہٹائے طاق رکھ کر دیکھا جائے تو بادی النظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ غالب کو کلام جمہ شعرائے اردو کے کلام سے بہتر اور برتر ہے۔ ذوق مرحوم کو ان کی معنی آفرینی اور نازک خیالی سے کچھ نسبت نہیں۔ ان کی عفاف و عام فہم غزلیں میرا درجہ ات کے کلام کو شرماتی ہیں۔ اور ان کی ادق اور مشکل غزلیں انشا۔ سودا اور ذوق کے کلام پر اوس برساتی ہیں۔ اگر ذوق نازک خیالی کے آسمان کے باز تھے۔ تو مرزا عقاب بلند پرواز تھے۔ اگر ذوق اقلیم سخن کے بادشاہ تھے۔ تو غالب کشور سخن کے شاہنشاہ تھے۔ ذوق کا نام ہندوستان کی چار دیواری تک محدود رہا۔ مگر غالب کا کلام ایران تک پہنچا۔ اور علم و زبان فارسی میں سند سمجھا گیا۔ مرزا ہمارے ادبی مقنن ہیں۔ شیخ صرف ایک شاعر

ہیں۔ مرزا ایک بینظیر نثار۔ نقاد اور مورخ بھی ہیں۔ باقی رسے سہرے۔ ان کے متعلق عرض ہے۔ کہ یہ دونوں اپنی جگہ بینظیر ہیں۔ مگر پہلے مرزا نے اپنی طبیعت پر زور ڈال کر سہرا کہا۔ انہوں نے ایک نئی چیز پیش کی۔ ذوق نے ان کے سہرے کو رد و رد کر سہرا کہا۔ جو ایک آسان کام ہے۔ باوجود اس امر کے سخن کے پرکھنے والے دیکھ سکتے ہیں۔ کہ کس کے سہرے کو ترجیح دینی چاہیے؟ اس تحریر کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے۔ کہ غالب کا سہرا ذوق کے سہرے سے بدرجہا بہتر ہے۔ غور و

ختم شد

فہرست اغلاط							
صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴	۲۰	اثریت	اثریت	۶۲	۱	طرز چرخ	طرز چرخ
۱۵	۱	الہیت	الہیت	۶۴	۷	سفید	سفید
۵	۱۹	سہیں	اسیں	۷۸	۱	بے علم تھے	بے علم نہ تھے
۱۹	۱	رکھتا	رکھتا	۷۸	۸	با خبر	با خبر
۲۰	۱	شیراز	شیراز	۸۱	۱۸	بالواسطہ	بالواسطہ
۲۰	۲۰	شاعری	خواب	۸۹	۱۹	مہنی	قائم
۴۶	۱۳	سنگیہ	اسفل	۲۲۴	۱۸	بڑی	بڑی
۵۳	۲۲	ترقیوں	ولفیوں	۲۳۰	۲	شاعر	انسان
۵۳	۲۷	زکین جھوٹ	زکین جھوٹ	۲۸	۱۳	چند	پسند
۵۴	۲۳	یہ	پر	۴۹	۹	اضاف	اضاف

نوٹ: اس فہرست میں موزوں ہی غلطیاں درج کی گئی ہیں۔ جنکی تصحیح زیادہ ضروری ہے۔

میان برادری کی تصنیف

(غیر مطبوعہ)

ماڈرن اردو لٹریچر | از میاں محمد صادق ایم۔ اے۔ پروفیسر ادبیات
ڈی مونٹ مورنسی کالج شاہ پور۔ میاں صاحب کی
انگریزی دانی اور قابلیت کا ایک زمانے میں شہرہ ہے۔ 'ماڈرن اردو لٹریچر' چار سو
صفحوں کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ تنقید نگاری میں پروفیسر صاحب میاں خاں
سے بھی زیادہ ماہر اور ہائے نظر ہیں۔ آپ کی تصنیف میں اردو ادب کے متعلق
نمائت صحیح اور بختہ رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ پروفیسر صاحب کا طرز تنقید بالکل
جدید ہے۔

ارمغان | پروفیسر صادق فکاہیہ نگاری میں دوسرے پطرس ہیں۔
'ارمغان' آپ کے جواب مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔

لسان العصر | از میاں تصدق حسین صاحب خالد ایم۔ اے۔ ای۔ اے۔
سی دریا ٹرڈ۔ خالد صاحب اردو کے ایک مشہور و معروف
شاعر اور نقاد ہیں۔ آپ کا طرز تحریر نہایت شگفتہ اور آراء نہایت
قائم ہیں۔ 'لسان العصر' میں اکبر الہ آبادی مرحوم کی شاعری اور شخصیت
بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے۔

ہدید اردو شاعری | حضرت خالد کی دوسری معرکہ آرا تنقیدی تصنیف
ہے۔ عین کئی بعض راؤں سے اختلاف ہو سکتا ہے

مگر کتاب کے ادبی محاسن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لطافت۔ شان و شوکت اور رنگینی خالد کی نشر کی بہترین خصوصیتیں ہیں۔

خالد کے خطوط | یہ وہ خطوط ہیں جو حضرت خالد نے ولایت سے اپنے بھائیوں اور والدین کی طرف تحریر فرمائے۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ خالد کے خطوط سادگی۔ شوخی۔ تحریر۔ مذاق۔ شگفتگی اور لطافت کے لحاظ سے غالب کے خطوط سے بھی زیادہ وسیع ہیں جناب خاوران کو نہایت اعتیاد سے ترتیب دے کر ایک پُر لطف قلم کے ساتھ شائع کرنے کا انتظام فرما رہے ہیں۔

ای ڈی پس بسکس | حضرت خالد کو ترجمہ کرنے میں خاص ہمارت ہے لفظی یا خیالی ترجمہ نہیں۔ جس کا ہمارے یہاں اس قدر رواج ہے۔ بلکہ وہ لطیف ترجمہ جس کو ادب کی جان قرار دینا چاہیے۔ میاں صاحب نے یونان کے شیکسپیر۔ سوفوکلز Sophocles کی تصنیف (Oedipus) کا ایسا نفیس ترجمہ کیا ہے کہ یہ اردو کا ایک نئے جے بہان کی

خواجہ زبیر حسرت | فرانس کے مشہور بزمید نویس مولیر (Moliere) کی دلچسپ کومیڈی (The Miser) کا بہترین ترجمہ ہے۔ خالد کے چٹخارے دار زبان اور تیزی و طراری ایک نہایت چلبلی طبیعت کی خبر دیتے ہیں۔

عذرا کی پنکھیا | انگلستان کے مشہور ادیب سکروڈائلڈ کے نام سے کون واقف نہیں؟ حضرت خالد نے اُسکی تصنیف (My Wandering Fair) کا بہترین ترجمہ کیا ہے۔

کلیم یا فریب ابلیس | جرمنی کے بزرگترین شاعر گٹے کی مشہور تصنیف

(Famous) کے پہلے حصے کا قابل تعریف ترجمہ ہے +

جناب خالد کے لطیف شاعرانہ نقوش کا ایک دلاور مرقع
خالد بزمیں ہے جس کا مقدمہ نفرت خاؤ نے تحریر کیا ہے +

اس کتاب میں آرٹ اور سائنس کا زندگی اور معاشرے
آرٹ اور سائنس کے ساتھ تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ میاں صاحب سائنس کے مسائل کو خوب سمجھتے ہیں اور ایک جید سائنس دان ہونے کے ساتھ اپنے بھائیوں کی طرح شعر و ادب کا بھی خاصہ ذوق رکھتے ہیں۔ اس نئے آپ نے جو کچھ لکھا ہے، ایک فاضل ادیب کی حیثیت سے لکھا ہے۔ آرٹ اور سائنس اردو میں اپنی قسم کی واحد تصنیف ہے +

(مطبوعہ) یہ عہد حاضر کی بہترین شاعرانہ تصنیف ہے اردو
گاندھی نامہ میں اس کے پایہ کی اور کوئی ٹھوس نظم موجود نہیں۔ میاں خاؤ
 اس تصنیف کے اردو ادب کی فضا پر بہت گہرا اثر پڑے گا۔ دیرینہ انقلاب کی رائے ہے کہ اگر
 یہ کتاب کسی اسلامی موضوع پر لکھی جاتی۔ تو میاں صاحب اسلامی ہند کی آنکھ کا
 نارا بن جاتے + اس سے آپ "گاندھی نامہ" کی ادبی وقعت کا اندازہ لگا سکتے
 ہیں۔ - حجم ۱۹۶ صفحے - قیمت - ایک روپیہ چار آنہ ملنے کا پتہ :- مصنف ہا غلامی پورہ - لاہور

غیر مطبوعہ

بجنوری مرحوم کے طرز میں غالب کی شاعری پر ایک پُر معنی تبصرہ
دیر الملک ہے - یادگار غالب کے ہندیہ دوسری کتاب ہے جس میں
 بڑا کے کلام اور شخصیت پر ہر پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے - خاؤ کے نزدیک غالب
 دو کام کے بڑا شاعر ہے - حتیٰ کہ میر اور اقبال بھی ٹھیل - فن اور شخصیت کے
 لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے - غالب کی عظمت کا راز اس کی بشریت -

دردِ دلی، تعلیمِ اخلاق، جدیدیت، اعلیٰ صناعت اور دیگر اہم امور میں مصغر ہے۔ غادر کی اس تصنیف میں غالب کی طبیعت اور کلام کا سب سے اچھوتا، جامع اور بے لطف مد کیا گیا ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ ناقدانِ فن نے اقبال کا آرٹ و شخصیت اب تک اقبال کی شاعری پر بحث کی ہے لیکن میں

اچھے مدحوں کی حیثیت سے کہی ہیں۔ غادر کے نزدیک ان کے مخالفوں اور مدحوں کا انداز تنقید بالکل غیر ناقدانہ اور غیر تسلی بخش ہے۔ ابھی تک کسی نقاد نے اقبال کے کلام پر آزادی کے ساتھ نظر نہیں ڈالی۔ جناب غادر ڈاکٹر اقبال کی فلسفیانہ شاعری کو بہترین متبادلاتہ شاعری سے کم رتبہ خیال کرتے ہیں۔ اور فنی حیثیت سے جس کی تشریح 'خاقانی ہند' میں کی گئی ہے۔ اب محترم علامہ کی شاعری میں بہت سی خامیاں دیکھتے ہیں۔ یہاں بھی غادر کی رائے دیگر نقادوں سے مختلف اور وزن دار ہیں۔

اردو شاعری کا دور جدید تین سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔ غادر کی رائے میں اردو شاعری کا بہترین دور ہمد عصر میں شروع ہوا ہے۔ حالی، اکبر اور اقبال اردو شاعری کے ارتقا کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اقبال کے بعد ایک فاضل ادبی دور کا آغاز ہوا ہے۔ جسکی بہترین شخصیت راشدہ خاں اور جوتس ہیں۔ حنیفہ اختر اور فاخر کا شمار بھی اچھے شاعروں میں ہو اگرچہ انہی دو شاعروں کی تخلیقی قوت اب بہت کچھ ماند پڑ چکی ہے۔

نیمبرہ | سفلو کلینز (Soflo Cleaners) کے مشہور ڈراما سٹوڈیو (Amidione) کا بنیئر رجم ہے۔ جو عنقریب شائع ہو گا۔

موج تبسم | غادر کے دلچسپ فلکابیہ مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہے نظم میں پیروڈی لکھنا غادر کی خاص ایجاد ہے، اور اس میں کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ترجمہ منجھو جیلے بکھر لو کہو جیل میں
علامہ محمد انارکلی لاہور

